ماہنامہ

حیاتِ نو

جنوری ۱۹۸۵ء

قرآن

"قرآن دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا پھر اس قوم نے اٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو پھر یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ چودہ سو برس سے اس کے ان اثرات کا سلسلہ جاری ہے اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے جا رہے ہیں۔"

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

ANJUMAN TALBA-E-QADEEM

جامعۃ الفلاح بلریا گنج - اعظم گڑھ یوپی (الہند)

BILARIAGANJ-AZAMBARH (U.P.) INDIA

انجمن طلبۂ قدیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

حیاتِ نو

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ (یو، پی)

ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ بمطابق جنوری ۱۹۸۵ء

مدیر مسئول — مطیع اللہ فلاحی مدنی
مدیر — طارق فارقلیط فلاحی

سالانہ زر تعاون ۲۵ روپیہ

فی شمارہ ۵۰–۲ روپیہ

○ اس دائرہ میں سُرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہوگیا ہے۔ براہِ کرم ۲۵ روپیہ ارسال کرکے مشکور فرمائیں۔

ترسیل زر کا پتہ ہے:۔ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ (یو، پی) 276121

(نشاط پریس ٹانڈہ)

نقوش حیات نو

			صفحہ نمبر
اداریہ	میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے	ایڈیٹر	۳
	دنیا پرستی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے	ادارہ	۵
بارگاہ خداوندی سے	دنیا یا آخرت	"	۶
بارگاہ رسالت سے	حضور ایک داعی تھے	طارق فاروق طالب فلاحی	۱۳
مطالعہ سیرت	آغا شورش کاشمیری مدینۃ النبی میں	آغا شورش کاشمیری	۲۴
عقائد افکار و نظریات	عقیدہ آخرت اس کی اہمیت و ضرورت	ابو مسعود فلاحی	۲۷
	حضرت ابراہیم کی وصیت	حافظ نعیم الدین اصلاحی	۹
	تدوین حدیث ایک جائزہ	توقیر عالم متعلم عربی ہفتم	۱۴
	جمہوری طریقۂ کار کی سب سے بڑی خامی امیدواری سسٹم	مولانا ابوبکر اصلاحی، استاد جامعہ	۱۹
	کمیونزم کی فکری بنیادیں	عبدالحق فاروق متعلم عربی ہفتم	۲۷
خاکہ	سید مودودی زندہ ہیں زندہ رہیں گے	مجیب الرحمان شامی	۳۰
تراجم و اقتباسات	تسبیح کائنات	ساجد الہ آبادی متعلم عربی ہفتم	۱۱
	قرآن	سید مودودیؒ	سرورق
	تحریک اسلامی اور مغربی تحریک	استاد [illegible]	۲۳
	ضعف ارادہ	سید مودودیؒ	۱۳
	اشتراکیت اپنے قلعہ میں	ایشیا	۳۳
شعر و نغمہ	غزل	مجیب عالم فلاحی، منصف صبا کپوری	۳۲/۱۱
میرا چمن	جامعہ کے لیل و نہار	حسن حبیب	۳۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

اما بعد عزیزم قارئین!

آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے ہم کو انتہائی خوشی اور مسرت ہو رہی ہے کہ آپ کا محبوب رسالہ حیات نو اب انشاء اللہ تعالیٰ ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتا رہے گا۔ اور آپ کو ہر ماہ پابندی سے پہنچایا کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے حیات نو کے لئے کافی انتظار کیا۔ انتظار کی گھڑیاں آپ پر کتنی شاق گذری ہونگی اس کا احساس ہمیں بھی ہے۔ لیکن آپ بھی شاید ہماری مجبوریوں سے بے خبر نہیں ہونگے۔

حیات نو [illegible] میں جاری ہوا۔ اور اس وقت سے اب تک کئی بار نکلا اور بند ہوا۔ البتہ اس بار انتظار کا لمحہ کافی طویل ہو گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ حیات نو کے لئے کوئی ایسا آدمی نہیں مل رہا تھا جو اس کی ذمے داریوں کو سنبھال سکے۔ اب خدا کا فضل ہے یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔

چنانچہ جنوری ۱۹۹۰ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ہم اپنی اس کوشش میں کتنا کامیاب ہوئے ہیں اور کتنا ناکام، اس کا فیصلہ آپ کریں گے اور اپنے فیصلے اور تجاویز و مشورے سے ہم کو مطلع کریں گے۔ ہم آپ کی تجاویز و مشوروں کے مطابق حیات نو کو آگے بڑھائیں گے انشاء اللہ

حیات نو جب تک بند تھا تو آپ مطمئن تھے لیکن اب آپ پر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اگر آپ اہل قلم ہیں تو سنجیدہ مضامین، تعمیری افسانوں اور فن پاروں سے ہماری مدد کریں۔

اگر آپ بہتر مشورے دے سکتے ہیں تو اپنے تجاویز و مشوروں سے ہمیں نوازیں۔

اگر آپ دوست احباب کا وسیع حلقہ رکھتے ہیں تو حیات نو کا تعارف کرائیں اور خریدار بنائیں اور اگر کچھ نہ کر سکتے ہوں تو ہم کو دوست و احباب اور رشتہ داروں کے پتے بھیجیں تاکہ حیات نو روانہ کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو تعاون کی توفیق دے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ملک جس میں ہم اور آپ رہتے بستے ہیں کبھی سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور امن و سکون کا گہوارہ تھا یہاں کے باشندے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے اور کسی ناگہانی مصیبت میں اپنا ممکنہ تعاون پیش کرتے تھے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب آپس میں بھائی بھائی تھے۔ ان کے دل ایک دوسرے کی محبت سے سرشار تھے۔ اور آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کوئی عداوت تھی نہ نفرت، جھگڑا تھا نہ لڑائی۔

یہاں گرونانک جیسا امن آشتی کا پیامبر، گاندھی جیسا اہنسا کا علمبردار، جواہر لال نہرو جیسا لیڈر، اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسا آزادی کا متوالا پیدا ہوئے۔ اس ملک کے اندر جانوروں تک کو مارنا گناہ اور پاپ سمجھا جاتا تھا لیکن آہ آج اس کی حالت کتنی ناگفتہ بہ ہے۔ آج ہر طرف ظلم ہے زیادتی ہے۔ تشدد ہے۔ مار دھاڑ ہے قتل و غارتگری ہے، لوٹ کھسوٹ ہے۔ آج اگر کوئی آدمی سفر پر جاتا ہے تو واپس آنے کا یقین اسے نہیں ہوتا۔ آج گھروں کے مکین رات کے

بخیریت گذر جانے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ آج ہر کسی بستی میں
رہنے والوں کو یہ خدشہ ہر آن لگا رہتا تھا کہ کب فساد کی
آگ بھڑک جائے۔ اور ان کی دوکانیں جلا دی جائیں۔ ان
کے بچوں کو ذبح کر دیا جائے اور ان کی عورتوں کا سہاگ اجاڑ
دیا جائے اور بہنوں کی ردائے عصمت تار تار کر دی جائے۔
تشدد دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اور عام ہوتا جا رہا ہے
لیکن یہ صورت حال کیونکر؟ اس کو کس نے پیدا کیا؟ یہ سوال
بار بار ہماری ذہنوں میں ابھرتا ہے اور جواب طلب کرتا ہے
کیا اس کے ذمہ دار انگریز ہیں مگر وہ تو اب چلے گئے۔ کیا اس
کا ذمہ دار جمہوری نظام ہے؟ کیا اس کے ذمے دار سیاسی لیڈر
ہیں؟ کیا اس کے ذمے دار مذہبی پیشوا ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ اس تشدد کے پھیلنے اور بڑھاوا
دینے میں ہر طبقہ ذمہ دار ہے۔ خواہ وہ امن پسند ہو یا تشدد
پسند، مذہبی پیشوا ہوں یا سیاسی لیڈر۔ کیونکہ اگر تشدد پسند
اور سیاسی لیڈروں نے اسے شہ دی تو امن پسند اور مذہبی
طبقہ خاموش تماشائی بنا رہا اور اس کو روکنے کے لئے آگے نہ
آیا لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے سیاسی طبقہ کچھ زیادہ
ہی ذمے دار ہے۔ انگریزوں نے ہندو مسلمانوں کے درمیان
"لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اپنا کر حکومت کی اور
اب وہی گر ہمارے سیاسی لیڈروں نے سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ
آج طاقت، قوت، دھونس، دھاندلی، تشدد دھمکی اور
ذات پات کو بنیاد بنا کر ووٹ حاصل کیا جاتا ہے اور ووٹ
لینے کے لئے ایک ذات کو دوسری ذات کے خلاف ایک طبقہ
کو دوسرے طبقہ کے خلاف ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کے
خلاف، ابھارا، اکسایا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر تشدد بڑھتا
چلا جاتا ہے اور اب اس نے ملک کی سب سے مقدس،
اعلی اور محفوظ شخصیت اندرا گاندھی کو اپنا نشانہ بنا کر خطرے
کا الارم بجا دیا ہے۔ اب ملک کے ہر شہری کو آگے بڑھنا چاہئے
اور اسے روکنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ خصوصاً ہم مسلم ملت
کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ وہ امن و شانتی
کی سب سے بڑی امین ہے وہ اٹھے اور اس حدیث انصر
اخاک ظالما او مظلوما کو بنیاد بنا کر آگے بڑھے
اور ملک سے تشدد کو دور کرنے کے لئے اپنا کردار ادا
کرے۔

دنیا میں کوئی ایسی قوم، اور ملت نہیں ہے جس کو
مسلم ملت سے بڑھ کر اتحاد اتفاق کا درس دیا گیا ہو اور دنیا
میں ایسی کوئی ملت نہیں جس کے اندر اتحاد کی اتنی بنیادیں موجود
ہوں جتنی مسلم ملت میں ہیں لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ
دنیا میں یہ ملت سب سے زیادہ انتشار اور افتراق کا شکار ہے
یہ ملت فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکی ہے اور جتنے ہی فرقے
اور جتنے ہی گروہ ہیں اتنے ہی قبلے اور کعبے ہیں گویا اس
ملت کا حال اس شعر کے مصداق ہے ع

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مسلمانوں کے بے شمار مسائل ان کو پریشان کئے
ہوئے ہیں۔ اردو کا مسئلہ ہے مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہے۔
وقف جائداد کا مسئلہ ہے بے روزگاری اور تعلیم کا مسئلہ ہے اور
سب سے بڑا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات کا ہے
کانگریس نے ۳۵ سال تک اس ملک پر بلا شرکت غیرے حکومت
کی ہے لیکن مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے اسے الجھایا
ہے اور نئے نئے مسائل لا کھڑا کئے ہیں، کیا مسلمان متحد ہو کر اور اپنے
ووٹوں کو کسی ایک پارٹی کے حق میں استعمال کر کے ان مسائل
کے حل کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں؟

یہ پرچہ جس وقت آپکے ہاتھوں میں ہوگا الکشن کی ہما ہمی ختم ہو چکی
ہوگی اور کسی ایک پارٹی کی حکومت بن گئی ہوگی لیکن یہ سوال ابھی باقی ہے؟

طارق فاروقی دسمبر ۱۹۸۴ء

درس قرآن

دنیا پرستی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے

ان سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے مخصوص ہے تب تو تمہیں چاہئے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے۔ اس لئے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے اس کا اقتضا یہی ہے۔ (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے (سورہ بقرہ آیت ۹۵،۹۴)

سورہ بقرہ کے اندر نہایت تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اللہ کے قانون اور اللہ کی شریعت کے ساتھ ان کے سلوک و برتاؤ کو واضح کیا گیا ہے اتنی تفصیل کے ساتھ قرآن نے کسی قوم کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ وجہ بالکل واضح ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہی دنیا کے امام اور پیشوا تھے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے انھیں کا انتخاب کیا تھا اور ان کے اندر بڑے بڑے جلیل القدر انبیا اور رسول اس غرض کے لئے مبعوث فرمایا۔ وان کے اوپر رحمتوں اور نعمتوں کی بارش کی۔

لیکن اس قوم کا کردار بڑا ہی افسوسناک رہا اس نے نبیوں اور رسولوں کا مذاق اڑایا۔ ان کو طرح طرح سے پریشان کیا اور بعضوں کو قتل کیا۔

خدا کی شریعت کا بھی مذاق اڑایا۔ اس کو بیچا اور فروخت کیا گنڈے اور تعویذ بنائے اسے دنیا کمانے کے لئے استعمال کیا۔ اس میں تحریف کی پوری پوری آیتیں اور احکام بدل دیئے۔ اور اپنے نفس کی پیروی کی۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود وہ یہ سمجھتے رہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں اسلئے ہم خدا کے محبوب اور لاڈلے ہیں خدا کے انعام و اکرام کے مستحق ہیں خدا ہم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا اور اگر بفرض محال کرے گا بھی تو چند ایام سے زیادہ ہم سزا کے مستحق نہیں ٹھہریں گے۔ وہ بڑے طمطراق سے کہتے تھے لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ۔ نحن ابناء اللہ و احباؤہ۔

اس غلط فکر نے ان کو آخرت سے مطمئن کر دیا تھا اور یہ وہ دنیا کمانے میں پوری طرح مصروف ہو گئے تھے اور ہر چیز کو دنیاوی مفاد اور مادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے دنیا کی چیزیں ان کو اتنی بھا گئی تھیں اور دنیا کے عیش و عشرت میں وہ اتنے ڈوب چکے تھے کہ ان کی تمنا اور آرزو یہ ہو گئی کہ کاش یہ دنیا ہمیشہ باقی رہتی اور وہ ہمیشہ زندہ رہتے موت کی دستک ان تک نہ ہوتی۔ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ وہ ایسی تمام جد و جہد سے دور رہنا چاہتے تھے جس کا انجام موت ہو موت کا ہر تصور ان پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ اس دکھتی رگ پر اس مذکورہ بالا آیت میں انگلی رکھی گئی ہے اور اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا بنی اسرائیل سے آپ پوچھئے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ آخرت میں تم کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا اور خدا کی نعمتیں اور رحمتیں تم پر سایہ فگن ہوں گی تو تم اپنے اس محبوب سے کیوں دور بھاگ رہے ہو تمہارے دلوں

(بقیہ صفحہ ... پر ملاحظہ فرمائیں)

درس حدیث!

دنیا یا آخرت

قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ دُنْیَاہُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِہٖ وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَہٗ اَضَرَّ بِدُنْیَاہُ فَاٰثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا یَفْنٰی (مشکوٰۃ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ)

حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو تباہ کرے گا۔ اور جس کو اپنی آخرت محبوب ہوگی تو وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ تو اے لوگو تم باقی رہنے والی زندگی کو فنا ہو جانے والی زندگی پر ترجیح دو۔

انسان جس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے وہ بڑی حسین نظر آتی ہے۔ دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف مناظر، آرائش و زیبائش دنیا کی عیش و عشرت، آرام و راحت حضرت انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور انسان سوچتا ہے کہ یہ دنیا کبھی ختم ہو۔ اور اس کو لطف و لذت کی چیزیں ہمیشہ میسر ہوں۔ وہ اس کے حصول کے لئے اپنی پوری طاقت، پوری قوت اور تمام سرمایۂ زندگی لگا دیتا ہے اور دوسری تمام چیزوں سے غافل اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔

اس دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا ہے جس کو عالم آخرت کہتے ہیں جس میں انسان کے اپنے عمل کے مطابق بدلے ملیں گے۔ وہاں آرام و راحت بھی ہے اور عیش و عشرت بھی لیکن نیک لوگوں کے لئے۔ وہاں رنج و غم بھی ہے اور مصیبت بھی برے لوگوں کے لئے۔ لیکن عالم آخرت کی تمام چیزیں دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔

انسان اگر آخرت کی کامیابی کو اپنا نصب العین بناتا ہے تو ظاہر ہے اس کے حصول کے لئے اپنی تمام توانائیوں اور قوتوں کو لگا دیگا یہاں تک کہ اس کی دنیا بھی مجروح ہوگی۔ اور اگر وہ دنیا کو ایک نصب العین کی حیثیت سے اختیار کرتا ہے تو اس کے حصول کے لئے زندگی کے تمام شب و روز صرف کر دے گا یہاں تک کہ اس کو آخرت کے مجروح ہونے کی پرواہ نہ ہوگی۔

لیکن عقلمندی اور دانائی کی بات یہ ہے کہ فانی اور مٹنے والی چیز کی قربانی دے کر دائمی اور ہمیشہ رہنے والی چیز کو حاصل کیا جائے۔

مضمون صفحہ پر ایک طرف اور خوش خط لکھ کر روانہ کریں۔

تمام فلاحی برادران اپنے موجودہ پتہ سے مطلع کریں۔

ابوسہیل فلاحی

عقیدہ آخرت اسکی اہمیت و ضرورت

اسلام کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے وہ توحید رسالت اور آخرت کے عقائد ہیں۔ جس طرح کوئی درخت اسی وقت مضبوط پائیدار اور ثمرہ بار ہو سکتا ہے جبکہ اسکی جڑیں کافی گہری ہوں اسی طرح اسلام کی عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا انحصار ان عقائد کی پختگی پر ہے۔ انسان کے دل میں جتنے زیادہ یہ عقائد راسخ ہونگے اسی قدر وہ اسلامی عبادات کا پابند اور اسلامی عادات و اخلاق سے آراستہ ہوگا اور جس کے اندر یہ جس قدر کمزور ہونگے اسی قدر اسکی زندگی اسلامی تعلیمات سے دور ہوگی۔ اسی کے پیش نظر عہد رسالت کے تیرہ سالہ مکی دور میں قرآن کریم نے سب سے زیادہ توجہ انھیں عقائد کو درست کرنے اور ذہنوں میں راسخ کرنے پر دی ہے پھر مدنی دور میں بھی وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی توجہ انکی طرف مبذول کرتا رہا ہے۔ زیر نظر مقالے میں ہم عقیدہ آخرت کی اہمیت و ضرورت اور انسانی زندگی پر اسکے اثرات کا جائزہ لیں گے

اہمیت و ضرورت ان تینوں عقائد میں عقیدہ توحید اصولاً اولین اہمیت کا حامل ہے لیکن عملی اعتبار سے عقیدہ آخرت ان سب پر مقدم ہے کیونکہ جس شخص کا دل اس احساس سے خالی ہو کہ اسے خالق کائنات کے روبرو پیش ہو کر حساب دینا ہے اور اپنے کئے کی جزا یا سزا پانی ہے اسکے سامنے نہ توحید و رسالت کی اہمیت کوئی ہے اور نہ ہی اسلامی سیرت و کردار اور عادات و اخلاق کی۔ بلکہ وہ اپنی لگام نفسانیت اور شہوت پرستی کے ہاتھوں میں دے کر بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کے اصول پر کاربند رہتا ہے یہ چیزیں تو اس شخص کے نزدیک اہمیت رکھتی ہیں جس کا دل خدا کے حضور جواب دہی کے احساس سے روشن ہو ذیل کی آیات کا بغور مطالعہ کیجیے ان میں یہی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَۃِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۔	جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس
وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (الانعام ۹۲)	کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔
اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَۃِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰکِبُوْنَ ۔ (مومنون ۷۴)	مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔
وَجَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَۃِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (بنی اسرائیل ۴۵)	ہم تمہارے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں
وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّهَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرۃ ۴۶)	صبر اور نماز سے مدد لو بے شک ایک سخت مشکل کام ہے مگر ان فرمانبرداروں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی

کی طرف پلٹ کر جاتا ہے

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ
بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ
رَبَّہُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝

ان آیات سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور صراط مستقیم کی ہدایت نماز کی پابندی اور دیگر اعمال صالحہ کی توفیق سے وہی لوگ نوازے جاتے ہیں جن کے دل میں فکر آخرت کی شمع جگمگاتی رہتی ہے اور جن کے دل اس شمع سے محروم رہتے ہیں وہ گمراہی اور ضلالت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور شیطان انھیں ایمان و اخلاق کی بے پایاں رفعتوں سے کفر و شرک کی نچلی سطح پر پھینک دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جتنی تفصیل سے آخرت کا ذکر کیا ہے کسی اور عقیدے یا عبادت کو اتنی تفصیل سے نہیں بیان کیا ہے حتیٰ کہ نماز جیسی اہم اور بنیادی عبادت کا بھی اتنی تفصیل سے ذکر نہیں ہے۔ کہیں کہیں تو پوری پوری سورہ آخرت کے پر ہول مناظر پر مشتمل نظر آتی ہے اور بہت کم ایسی سورتیں ملیں گی جن میں آخرت کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہ کیا گیا ہو

عقیدۂ آخرت کی اہمیت و ضرورت پر غور کرتے ہوئے یہ پہلو بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ یہ دراصل عقیدۂ توحید ہی کا ایک جز ہے اور جب تک آدمی اسے اچھی طرح اپنے دل میں اتار نہ لے اسکا عقیدۂ توحید نامکمل رہتا ہے کیونکہ توحید کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو اسکے تمام صفات کے ساتھ یکہ و تنہا جاننا اور اسکی ذات کو بری صفات سے بری اور اچھی شایان شان صفات سے متصف قرار دینا اور اسکی صفات میں ربوبیت، رحیمیت، قسط (عدل)، علم اور حکمت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جسکا مفہوم یہ ہے کہ اسکا ہر کام مبنی بر حکمت ہوتا ہے اور یہ کائنات بھی اسکی حکمت ہی کے تحت وجود میں آئی ہے وہ پوری کائنات کا پروردگار اور فرمانروا ہے وہ بندوں کے درمیان منصفانہ فیصلہ کرتا ہے اور انکے اوپر حد درجہ مشفق و مہربان ہے۔

عقیدۂ آخرت تسلیم نہ کرنے کی صورت میں یہ ساری صفات بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہیں اور دنیا کی تخلیق بے مقصد اور بے حکمت ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ اگر ہم دنیا میں بسنے والے انسانوں پر نظر ڈالیں تو یہ بات اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ دنیا میں کتنے لوگ اپنی پوری زندگی نفسانیت اور شہوت پرستی اور ظلم زیادتی میں گزار کر فنا کی نیند سو جاتے ہیں۔ اور اپنے کیفر کردار کو نہیں پہنچ پاتے اور کتنے ہی لوگ نیکی و پرہیزگاری کے ساتھ مظلومیت مفلوک الحالی میں زندگی بسر کرتے ہوئے موت کی ناپید اکنار وادیوں میں اتر جاتے ہیں اور انکے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔

ان صفات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں وہ لوگوں سے اپنے علم کی بنیاد پر محاسبہ کرے اور نفس پرستوں اور ظالموں کو انکے کیفر کردار تک پہنچائے اور نیکوکاروں اور مفلوک الحالوں کے ساتھ انصاف کرے اور انھیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے ڈھانپ لے چنانچہ قرآن میں اکثر و بیشتر مقامات پر اس طرح کی صفات بالخصوص صفت ربوبیت کا حوالہ ذکر ہوتا ہے جس سے بتلانا یہ مقصود ہوتا ہے کہ ان صفات کا بھی۔ یہی تقاضا ہے کہ آخرت واقع ہو اور لوگوں سے حساب لیا جائے مثال کے طور پر آیات ملاحظہ ہوں

قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ — کہہ دو نہیں میرے رب کی
ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا — قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

حافظ نعیم الدین اصلاحی

حضرت ابراہیم کی وصیت

حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب نے اپنے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ میرے فرزندو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین اسلام کا انتخاب کیا ہے لہٰذا تمہیں موت نہ آئے مگر اسلام کی حالت میں۔"

تمام انبیاء علیہ السلام کا پیغام ایک ہی رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی زندگی تمام لوگوں کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے۔ قرآن نے تمام ہی انبیاء کی پیروی کی ہدایت فرمائی ہے۔ "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ" (سورہ انعام ۹۰) تمام سارے انبیاء علیہم السلام میں سیدنا ابراہیم کو یہ شرف اور فضیلت حاصل ہے کہ آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح آپ کی زندگی کو بھی تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ" سورہ ممتحنہ

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی مبارک زندگی کے مختلف گوشے پیش کئے گئے ہیں۔ جو اس لائق ہیں کہ ان پر بھرپور توجہ دی جائے۔ اور اپنی تعمیر سیرت میں ان سے استفادہ کیا جائے۔

حضرت ابراہیم کی وصیت اپنے بیٹے کو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہر آدمی کے نزدیک وصیت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ باپ کی وصیت کو تمام ہی انسانوں کے نزدیک قابل لحاظ اور واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ تمام انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے اولاد کے سلسلے میں محبت و شفقت، ہمدردی و خیرخواہی کا بے پناہ جذبہ رکھا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ کوئی باپ بھی جان بوجھ کر اپنے بچے کو کوئی غلط مشورہ نہ دے۔ یہ تو تمام انسانوں کا معاملہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو وہ اپنی اولاد اور متعلقین کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے اولین مخاطب سب سے پہلے اس کی اولاد و بیویاں اور اصل خاندان ہوتے ہیں۔ اسی مسئولیت اور ذمہ داری کے احساس کے تحت حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو وصیت کی۔

اس عظیم باپ نے اپنے عظیم فرزند کو انتہائی اہم وصیت کی تھی جس کا ایک ایک لفظ نصح و خیرخواہی، ہمدردی و مہربانی سے پُر ہے اسی لئے اس فرزند نے اپنی پوری زندگی اس وصیت کو ملحوظ رکھا اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جو اسلام کی مکمل تابعداری اور ایثار و قربانی کا شاہکار نہ ہو۔ باپ نے جب فرزند عزیز کو اپنا خواب سنایا اور اس کی رائے دریافت کی تو اس نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے یہ جواب دیا۔ "ابو جان آپ کر گذریے وہ جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔" مجھے انشاء اللہ صابر پائیں گے۔

حضرت اسماعیل کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا یہ لفظ تربیت کا واضح ثبوت ہے۔ اور وصیت کے اثرات پر دال ہے قرآن حضرت اسماعیل کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "وہ وعدے کا پکا اور سچا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس ابو ہے باپ سے انہوں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔

حضرت اسماعیل جیسا عظیم فرزند جس کی کتاب زندگی کا ہر صفحہ اسلام، اطاعت اور فرمانبرداری جیسے اوصاف سے مزین اور آراستہ تھا اس لائق تھا کہ اس کی ذریت سے ایک ایسی ملت کو اٹھایا جائے جس کا امتیازی نشان ہی اطاعت شعاری اور وفاکیشی ہو قرآن کا ارشاد ہے۔ "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" خدایا ہم کو اپنا اطاعت شعار بنا اور ہماری ذریت میں سے ایک اطاعت گزار ملت کو برپا کر۔" معلوم ہوا کہ امت مسلمہ کا وجود بھی ان دونوں کی پر خلوص

علاوہ کوئی دین مقبول نہیں ہے۔ سورہ حج کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا۔ "هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ" اس نے تمہارا نام مسلم رکھا۔ سورہ آل عمران میں اہل کتاب کی ضلالت و گمراہی کے ذکر کے بعد مسلمانوں کو ان کے اتباع سے روکا گیا ہے اور حق کے ساتھ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر اسلام کی حالت میں۔ غور کیجئے اس آیت کا ایک ٹکڑا وصیت ابراہیمی سے جڑا ہوا ہے۔ صرف خطاب بدلا ہوا ہے۔ ورنہ دونوں کی غایت دونوں کا خلاصہ اور دونوں کی روح ایک ہی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل کو وصیت کی ہے اور انہیں کی ذریت سے امت مسلمہ کا وجود ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ملت ابراہیمی کہتے ہیں۔ دور اول میں اس امت کا ایک ایک فرد اپنے نمایاں مقام اور اعلیٰ وصف سے پوری طرح باخبر تھا اور اس کی پوری زندگی اللہ کی خیر، خشیت، اطاعت اور فرمانبرداری میں گزرتی اس راہ میں بڑی بڑی آزمائشوں کو بھی جھیل جاتے۔ حضرت خبیبؓ پکار کر کہتا "فلست ابالی حین اقتل مسلما" مجھے مار ڈالو مجھے موت کی کچھ پرواہ نہیں ہے کیونکہ میری موت تو اسلام کی حالت میں ہو رہی ہے۔"

امت مسلمہ نے جب تک [illegible] ابراہیمی وصیت کو اپنے سامنے رکھا کامیابی ان کے قدم چومتی رہی لیکن جب انھوں نے اسے فراموش کر دیا تو (ابراہیمی) ذلت اور رسوائی اور ادبار و تنزل کی گھٹائیں اسی طرح چھا گئیں جس طرح بنی اسرائیل پر مجرمانہ غفلت اور وصیت ابراہیمی سے کھلی بغاوت کے نتیجے میں چھا گئی تھیں۔ کیونکہ قانون فطرت ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ مسلم اور فرمانبردار بندے ہمیشہ نوازے جاتے رہے اور باغیوں اور سرکشوں پر ہمیشہ تازیانہ عذاب برستا رہا۔ حضرت ابراہیم کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ تمہاری ملت کے مطیع و فرمانبردار لوگوں کو ہم نوازیں گے نوازتے رہیں گے۔ رہے باغی اور سرکش لوگ تو "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ"

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شبلی نیشنل کالج (اعظم گڑھ) میں انگریزی کے استاد تھے۔ وہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۳ء تک یہاں رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن میں انگریزی کا کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہے پر جا کر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ وہ اخبار کا بنڈل اپنے ہاتھوں میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور لوگوں سے کہتے "اس پارٹی کی سچائی میں کون شک کر سکتا ہے۔ جس میں ایک پروفیسر سڑک پر کھڑا ہو کر اخبار بیچے۔"

دوسری مثال شیخ محمد سلیمان القاضی کی ہے۔ وہ افریقہ کے ملک مالی میں دعوتی کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں بہت سے نوجوان ہیں جن کے اندر تبلیغ کا جذبہ ہے مگر وہ غریب ہیں۔ انہوں نے ملک کے مختلف علاقوں سے کئی درجن نوجوان منتخب کئے۔ ان کے لئے ایک مختصر مشاہرہ مقرر کر دیا اور ہر ایک کو ایک ایک بائیسکل دے دی۔ یہ نوجوان بائیسکلوں پر گھوم گھوم کر تبلیغ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں پانچ سال (۷۴ — ۱۹۷۹) کی مدت میں تقریباً ۷۰ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا۔"

(الرسالہ دسمبر ۱۹۸۳ء)

صفحہ ۲۹ سے آگے کمیونزم

وہ اپنی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ کبھی زراعتی نظام قائم کرتا ہے، کبھی جاگیردارانہ نظام قائم کرتا ہے، اور کبھی سرمایہ دارانہ نظام قائم کرتا ہے۔ مگر یہ سارے تقاضے اصلی ضرورت ۔۔۔ کھانا کپڑا اور مکان کو صحیح طور پر حل نہیں کرتے بلکہ جو طبقہ ذرائع پیداوار پر قابض ہوتا ہے وہ دوسروں کا استحصال کرنے لگتا ہے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو کا پہلا فقرہ ہے کہ انسان نے اب تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے، غلام اور آقا، امراء اور عوام، سرمایہ دار اور مزدور غرض کہ ظالم اور مظلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے ہیں۔

الدکتور محمد ابو النور الحدیدی (التضامن الاسلامی)
مترجم ساجد الہ آبادی

تسبیح کائنات

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

اللہ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا۔

(الاسراء ۴۴)

قرآن کی بیشتر سورتوں میں اثبات توحید اور ابطال شرک کا مضمون بیان ہوا ہے اثبات توحید کیلئے قرآن دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ کائنات کے ذریعہ خصوصی طور پر استدلال کرتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان کو جس چیز سے سب سے زیادہ سابقہ پیش آتا ہے وہ یہی کائنات ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص کائنات کی رنگینیوں اور اس کی جلوہ سامانیوں کو دیکھے تو خدائے واحد کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۸۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں خواہ وہ عاقل ہوں یا غیر عاقل جاندار ہوں یا بے جان نباتات ہوں یا جمادات اور خواہ حیوانات کی جنس سے ہوں سب کی سب اللہ کی تسبیح میں مصروف ہیں لیکن ان کی یہ تسبیح ایسی زبان میں ہوتی ہے جس کو انسان براہ راست سمجھنے سے قاصر ہے مخلوقات میں بعض تو عاقل ہیں مثلاً ملک، انسان جنات وغیرہ اور بعض غیر عاقل مثلاً حیوانات نباتات اور جمادات یہ عاقل و غیر عاقل تمام مخلوقات خدا کی تسبیح کرتی ہیں جیسا کہ آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس تسبیح کی کیا کیفیت ہے تسبیح کے اعتبار سے ہم مخلوقات کو تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) پہلی قسم مخلوقات میں سے عقلاء کی ہے جو توحید کے قائل ہیں یعنی ملائکہ، مومن انسان اور مسلم جنات یہ لوگ زبان حال اور زبان قال دونوں سے کرتے ہیں اور وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق و موجد ایک مدبر ہے جس کی فرمانروائی ساری کائنات پر ہے۔

(۲) دوسری قسم کافر انسانوں اور جنوں کی ہے چنانچہ یہ لوگ اپنی زبان سے اللہ کی تسبیح تو نہیں بیان کرتے ہیں لیکن ان کی زبان حال اللہ کی عظیم قدرت اس کی حکمت اس کے تدبر کا اقرار کرتی ہے اور وہ مزید اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سوا کوئی حقیقی معبود ہے۔

(۳) تیسری قسم حیوانات وجمادات ونباتات کی ہے ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ زبان حال سے اللہ کی حمد بیان کر رہی ہیں یا زبان قال سے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ وہ زبان حال سے اللہ کی حمد بیان کر رہی ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ سب بھی عاقلوں کی طرح زبان قال سے اللہ کی حمد بیان کر رہی ہیں اور اللہ کے اس قول سے مراد یہی ہے کہ یہ چیزیں اپنی زبان سے حمد بیان کر رہی ہیں لیکن ان کو سمجھنے سے لوگ قاصر ہیں کیونکہ وہ انسانوں کی زبان میں حمد نہیں بیان کرتیں۔ بلکہ وہ ایک ایسی زبان میں کرتی ہیں جس کو لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

اللہ نے سلیمانؑ کو داؤدؑ کا وارث بنایا بادشاہت میں بھی اور نبوت میں بھی یہاں تک کہ انس و جن اور طیور کو بھی ان

کیلئے مسخر کر دیا تھا اور پرندوں چیونٹیوں کی زبان سمجھنے کی بھی صلاحیت دی تھی چنانچہ جب وہ اپنی فوج کے ساتھ وادی نمل سے گزر رہے تھے تو ایک چیونٹی نے اپنی ساتھی چیونٹیوں سے کہا کہ تم اپنی پناہ گاہوں میں داخل ہو جاؤ ورنہ سلیمانؑ کا لشکر تم کو کچل دے گا اور ان کو احساس بھی نہ ہو گا پس سلیمانؑ نے جب یہ سنا تو وہ سمجھ گئے اور اس کی بات پر مسکرانے لگے۔ اسی طرح بخاری میں ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم لوگ کھانے کی تسبیح سنتے تھے جبکہ وہ کھایا جاتا تھا اسی طرح مسند کی ایک مشہور روایت ہے کہ رسول ﷺ نے کنکریوں کو ہاتھ میں لیا پس آپ نے ان کو تسبیح کرتے ہوئے سنا جس طرح شہد کی مکھیاں جھنجھناتی ہیں اسی طرح یہ بھی تسبیح بیان کر رہی تھیں۔

چنانچہ جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی مخلوق نہیں ہے جو اللہ کی حمد بیان کر رہی ہو پس اس کے بعد ہر ذی عقل و خرد انسان کیلئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے اور اس قدر صبح و شام اس کی حمد بیان کرے کہ کائنات کی دوسری مخلوقات اس سے آگے نہ بڑھ پائیں۔ لیکن اگر انسان اللہ کی ہدایات کی پیروی نہ کرے تو وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے جہنم کو بہت سے ایسے انسانوں اور جنوں سے بھر دیں گے جو دل رکھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں یہ لوگ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ غفلت میں پڑے رہنے والے ہیں۔

غزل

محبوب عالم علاجی

آؤ کہ ہم بھی جشن منائیں بہار میں
نغمے سرور و کیف کے گائیں بہار میں
ہم بھی کچھ اور رنگ دکھائیں بہار میں
الفت کے گر نشاں کہیں پائیں بہار میں
کیوں رہیں نہ ہم تحفظ گلہائے تر یہاں
آثار کیف گر نظر آئیں بہار میں
عفت کی خوں چکاں ابھی لاشیں ہیں جابجا
ظلم و ستم کی اف یہ وبائیں بہار میں
گلیوں میں ہے عفونت خوں بابے گنہ
اللہ رے یہ ایسی جفائیں بہار میں
اہل وطن جلاتے ہیں لوگوں کے آشیاں
ہم آؤ انکو پھر سے بنائیں بہار میں
لازم ہے اپنے طور سے رخ انکا موڑنا
چلتی ہیں جو خزاں کی ہوائیں بہار میں
بالجبر جب بہار پہ قابض ہیں دو لوگ
ہم اپنا حسن طبع دکھائیں بہار میں
رنگینیاں چمن کی پریشاں ہیں گر انھیں
گلہائے حسن کار کھلائیں بہار میں
اس سے نہ ہو گا حسن چمن اور کچھ فزوں
کاغذ کے پھول لاکھ بنائیں بہار میں
آہ و فغاں نہیں ہے مداوائے رنج و غم
عالم کچھ اور سوچیں دوائیں بہار میں

ضعف ارادہ

جو فرد کو اندر سے کھا جاتا ہے

اجتماعی زندگی میں انفرادی کمزوریوں میں سے ایک نہایت مہلک کمزوری ضعف ارادہ بھی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک تحریک کی دعوت سن کر اسے صدق دل سے لبیک کہتا ہے اور اول اول خاصا جوش دکھاتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے اس مقصد سے نہ تو کوئی حقیقی لگاؤ باقی رہتا ہے جس کی خدمت کے لئے وہ آگے بڑھا تھا۔ اور نہ اس جماعت کے ساتھ کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے جس میں وہ دلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کا عقیدہ بدستور ان دلائل پر مطمئن رہتا ہے جن کی بنا پر اس تحریک کو اس نے برحق مانا تھا۔ اس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے۔ اس کے دل کی شہادت بھی یہی رہتی ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کسی بددیانتی کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے آدمی جماعت چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ مگر بس وہ ارادے کی کمزوری ہوتی ہے جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیتی ہے۔

ضعف ارادہ کا ابتدائی ظہور کام چوری کی صورت میں ہوتا ہے۔ آدمی ذمہ داریاں قبول کرنے سے جی چرانے لگتا ہے۔ حق کی راہ میں وقت، محنت اور مال خرچ کرنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے کام کو اس کام پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ جسے وہ زندگی کا نصب العین قرار دے کر آیا تھا۔ اس کی مشغولیتوں میں اس کے سال میں "اس کے نام نہاد مقصد حیات" کا حصہ کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے اور جس جماعت کو وہ برحق جماعت مان کر اس سے وابستہ ہوا تھا اس کے ساتھ بس صرف نظم و ضابطے کا تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بھلے اور برے سے کوئی غرض نہیں رکھتا نہ اس کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے۔

یہ حالت پھر اس طرح بتدریج طاری ہوتی ہے۔ جیسے بڑھاپا آتا ہے۔ اگر آدمی اپنی اس کیفیت پر خود نہ متنبہ ہو، نہ کوئی اسے متنبہ کرے تو کسی وقت بھی وہ یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جس چیز کو میں اپنا مقصد زندگی قرار دے کر جان و مال کی بازی لگانے کے لئے اٹھا تھا۔ اس کے ساتھ اب کیا معاملہ کرنے لگا ہوں۔ یوں محض غفلت اور بے خبری کے عالم میں آدمی کی دلچسپی و وابستگی بے جان ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی روز بے خبری ہی میں اس کی طبعی موت واقع ہو جاتی ہے۔"

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز

طارق فارقلیط

حضور ایک داعی تھے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو جہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضور اکرم خاتم النبیین کی زندگی کا ہر گوشہ نہایت کامل اور مکمل ہے وہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ حضور کی زندگی میں دعوت کا پہلو تمام پہلوؤں پر غالب ہے۔ آسمان سیرت میں اس کو وہی مقام حاصل ہے جو آسمان دنیا میں چاند کو حاصل ہے۔ ستارے اپنی ایک مستقل حیثیت اور چمک رکھتے ہیں لیکن چاند جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی ہر ایک کا احاطہ کر لیتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ۲۳ سالہ دور اس کی تائید کرتا ہے۔

غار حرا کی سنسان تنہائی میں جب حضرت جبرئیل کلام ربانی لے کر اترے اور حضور کے قلب مبارک پر اس کے اثرات اس طرح مرتب ہوئے کہ آپ کلام الٰہی کے وجود اور احساس ذمہ داری سے کانپ اٹھے اور حضرت خدیجہؓ سے نہایت بے چینی کے عالم میں فرمایا زملونی زملونی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی چند ابتدائی آیتوں کو سن کر یہ اندازہ کر لیا کہ یہ کتنا بڑا بوجھ ہے جو میرے سر ڈالا گیا ہے۔ اور اس کا انجام اور اس کے نتائج کیا ہوں گے اور ورقہ بن نوفل نے آپ کے ان احساسات کی تصدیق کر دی۔ یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ پر اترا تھا اور یہ وہی ذمہ داری ہے جو حضرت نوحؑ پر ڈالی گئی تھی لوگ آپ کی تکذیب کریں گے۔ آپ کو وطن سے نکالیں گے اور آپ سے لڑیں گے اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں آپ کی بھرپور حمایت کروں گا۔

آپ نے [illegible] مصائب و مشکلات کو خاطر میں نہ لا کر، خدا کے بھروسہ پر اس پیغام کو عام کرنا شروع کیا۔ آپ نے ابتدا اپنی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ سے کیا اور تین سال تک چھپکے چھپکے اس دعوت کو عام کرتے رہے۔ مکہ کی خوش بخت اور سعید روحیں اس پیغام کو حرز جاں بناتی رہیں اور چراغ سے چراغ جلتا رہا، روشنی پھیلتی رہی اور اندھیرا سمٹتا رہا۔

اس تین سال کی مدت میں حضرت خدیجہؓ حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن وقاص، حضرت طلحہؓ، عمار، خباب، ارقم، سعید بن زید، عبداللہ بن مسعود، عبیدہ، صہیب وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے تھے اور خدا کے اس پیغام کو تن، من، دھن کی بازی لگا کر آگے بڑھا رہے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بھی خاموش نہیں بیٹھے آپ ہر آن اور ہر لمحہ اس کوشش میں رہے کہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام پہنچ جائے اور لوگ خدا کی وحدانیت کو قبول کر کے کفر و شرک سے تائب ہو جائیں اور آپ خاموش کس طرح بیٹھ سکتے تھے۔ آپ اپنی آنکھوں سے دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھ رہے تھے اور آپ کو یقین کامل تھا کہ اگر یہ لوگ خدا کی وحدانیت کا انکار کریں گے تو اس کا ایندھن بن جائیں گے۔ ایک بار آپ نے اپنے کرب و بے چینی کا حضرت عائشہؓ سے ان الفاظ میں اظہار کیا۔ میری اور اس قوم کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی جب آگ روشن ہو گئی تو پتنگے اس میں گرنے لگے اور وہ شخص ان کو بچانے لگا۔ میری قوم کے لوگ آگ کی طرف بڑھے جا رہے ہیں اور میں ان کی کمر پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں۔

حضورؐ کی اس حدیث پاک میں جس کی ترجمانی یہاں کی گئی کتنا سوز اور کتنا درد ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ داعی کے اندر جب تک اپنی دعوت کے لئے سوز و گداز نہ ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ذرا غور کیجئے ان حالات کا جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ کتنے کٹھن تھے وہ حالات اور کتنے مخالف تھے اہل وطن کے جذبات، ایک بھی ساتھی اور رفیق نہیں۔ ایک بھی ہم عقیدہ اور ہم مسلک نہیں۔ لیکن حضورؐ نے نہایت عزم، ہمت، حوصلہ اور جوانمردی سے اس دعوت کا اس طرح آغاز کیا جیسے آپ اس کے روشن افق پر کامیابی کے چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ رہے ہوں۔

پھر جب "فاصدع بما تؤمر" کا حکم آیا تو آپ نے کوہ صفا کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ کر اپنی قوم کو پکارا اور جب پوری قوم آپ کے گرد اکٹھا ہو گئی تو آپ نے نہایت مختصر اور جامع انداز میں اپنی دعوت کو پیش کیا اور اپنی قوم کو اس خطرے سے آگاہ کیا جو ان کی طرف بڑھا آ رہا تھا آپ نے قریش کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، "اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک حملہ آور فوج چلی آ رہی ہے تو کیا تم مجھ پر اعتماد کرو گے" قریش نے یک آواز کہا۔ "ہاں کیوں نہیں، آپ صادق اور امین ہیں۔"

آپ کے ہونٹ پھر وا ہوئے اور زبان مبارک سے وہ الفاظ ادا ہوئے جس کو تاریخ نے محفوظ کر لیا۔ "تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا پر ایمان لاؤ ورنہ سخت عذاب نازل ہوگا۔"

دعوت کا دوسرا دور بہت اہم بھی تھا اور وسیع بھی۔ اب اسلام کی دعوت، اسلام کا پیغام مکہ کی فضاؤں میں گونج رہا تھا اور ہر در و بام سے ٹکرا رہا تھا اور نتیجے کے طور پر مخالفت بھی سر اٹھا رہی تھی۔ پہلے لاپرواہی رہی بے اعتنائی پھر گندے جملے پھبتیاں [illegible]

حضورؐ کی زندگی میں وہ لمحہ بڑی اہمیت کا حامل تھا اور بڑے دور رس نتائج پیدا کر سکتا تھا جب کفار قریش نے ابو طالب کو دھمکی دیتے ہوئے کہا، اے ابو طالب، تم ہمارے درمیان عمر، شرف اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک بڑا درجہ رکھتے ہو۔ ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ اپنے بھتیجے سے ہمیں بچاؤ۔ لیکن تم نے یہ نہیں کیا۔ اور خدا کی قسم جس طرح ہمارے باپ دادا کو گالیاں دی جا رہی ہیں، جس طرح ہمارے بزرگوں کو احمق قرار دیا جا رہا ہے اور جس طرح ہمارے معبودوں پر حرف گیری کی جا رہی ہے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ الا یہ کہ تم اسے باز رکھو یا پھر ہم اس سے بھی اور تم سے بھی لڑیں گے یہاں تک کہ ایک فریق کا خاتمہ ہو جائے (محسن انسانیت)

ابو طالب اس دھمکی کی تاب نہ لا سکے اور بھتیجے کو طلب کر کے صورت حال سے واقف کرتے ہوئے نہایت لجاجت سے کہا بھتیجے میں بوڑھا ہو گیا ہوں مجھ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صورت حال کو بھانپ لیا کہ اس وقت تھوڑی سی مصلحت بھی سالوں پیچھے دھکیل سکتی ہے بلکہ اب تک کی جدوجہد کا خاتمہ کر سکتی ہے آپ نے پورے داعیانہ کردار کے ساتھ اپنی زبان مبارک سے وہ الفاظ ادا کئے جس کو تاریخ نے سنہری حرفوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو تھے آواز عزم و ہمت لئے ہوئے سوز میں ڈوبی ہوئی تھی اس طرح نکل رہی تھی، چچا جان! خدا کی قسم یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ جائیں کہ اس مشن کو چھوڑ دوں تو میں تب بھی باز نہیں آ سکتا، یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کر دے یا میں اس جدوجہد میں ختم ہو جاؤں۔ (محسن انسانیت)

توقیر عالم عربی ہفتم

تدوین حدیث

ایک مختصر جائزہ

حدیث کا مقام | قرآن وحدیث ہی شریعت اسلامی کے افہام وتفہیم کے دو مستند ذرائع ہیں۔ انھیں دو چیزوں پر اسلام کی شاندار عمارت قائم ہے۔ اسلامی شریعت کے اسرار ورموز کا علم اور زندگی گزارنے کے سو وضع طریقوں سے واقفیت احادیث رسول ﷺ کو جانے بغیر ناممکن ہے۔ احادیث کے مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم۔ ہم نے قرآن کریم آپ پر اس لئے اتارا کہ جو کچھ ان لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے اسے کھول کھول بتا دیجئے (النحل ۴۴) دوسرے مقام پر حدیث کو قرآن مجید کی تشریح قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا۔ وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یومنون (۶۴) ہم نے یہ کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے مان لیں۔ دوسرے مقام پر سورہ جمعہ میں معلم حکمت کے مقصد کو یوں واضح کیا گیا ہے:

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ... وہ ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ وہ اس کی آیات ان پر تلاوت کرے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور انھیں کتاب الہی اور حکمت کی تعلیم دے (جمعہ آیت ۲)۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ یقیناً خالق کائنات نے نسخۂ کیمیا دے کر بے پایاں احسان کیا ہے لیکن یہ بھی خوب واضح ہو گیا کہ قرآن کی کما حقہ معرفت شناسی حضور اکرم کی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے پھر خود آپ نے مومن کی اصل کامیابی کے حصول میں سنت کی معرفت کو جزو لاینفک قرار دیتے ہوئے آخری حج کے موقع پر فرمایا تھا۔

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان سے چمٹے رہوگے گمراہ نہیں ہوگے اور وہ دو چیزیں ہیں قرآن وسنت۔ امام شاطبی سنت کے مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں فکانت السنۃ بمنزلۃ التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب، سنت کتاب اللہ کے احکام کے معنیٰ کے لئے تفسیر وشرح کا درجہ رکھتی ہے

(محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے طبع اول صفحہ ۱۱)

قرآن میں حکمت کی تعلیم جو حضور کی طرف منسوب ہے۔ دراصل اس کا مفہوم ہے سنت کی تعلیم۔ امام جریر طبری اپنی تفسیر میں بہت سے علماء کے اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں والصواب من القول عندنا فی الحکمۃ انھا العلم باحکام اللہ التی لا یدرک علمھا الا ببیان الرسول والمعرفۃ بھا وما دل علیہ ذلک من نظائرہ وھو عندی ماخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الباطل والحق۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت احکام

الٰہی کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان و تشریح سے معلوم ہوتا ہے اور حکمۃ کا لفظ عربی کے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کے ہیں (تفسیر ابن جریر بحوالہ محدثین عظام اور ان کے کارنامے طبع اول صفحہ ۱)

عالم اسلام کے ممتاز اسکالر محمد اسد صاحب جرمنی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"our reasoning tells us That There could not Possibly be a better interpreter of The Quranic Teachings Than he Through whom They were revealed To humanity (Islam at The crossroad Page No 117 Edition)

ترجمہ:۔ ہمارا استدلال یہ کہتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا شارح اس شخص سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا جس کے ذریعہ تعلیمات نوع بشر تک پہنچائی گئی ہیں۔ علامہ تقی الدین ندوی صاحب لکھتے ہیں۔ حدیث کا بڑا حصہ متواتر رہا ہے کہ حدیث قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے۔ پس اگر قرآن کی تشریعی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے بیان و شرح کی تشریعی حیثیت ماننی پڑے گی۔ قرآن مجید پر جن علماء کی عمیق و وسیع نظر ہے انہیں برملا معلوم ہے کہ احادیث صحیحہ تمام تر قرآن پاک ہی کے وضعی احکام کے تحت شدہ ہیں۔ (محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے طبع اول صفحہ ۱۰)

تدوین کی ضرورت

مندرجہ بالا توضیحات اور رسول اکرمؐ کی بعثت خاص کے ذکر سے حدیث کی اہمیت پر بطریق احسن روشنی پڑتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ رسالت کے مقصد اس نوعیت خاص کی تکمیل اور قرآن کے اسرار و رموز سے واقف ہونے کے لئے تدوین حدیث کا مقدس فریضہ نہایت ہی اہم فریضہ تھا۔ قرآن کریم سے استفادہ اور نبی کریمؐ کی دوسری حیثیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امت مسلمہ پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ احادیث کی حفاظت کے لئے ایسی بار آور کوشش کرے کہ تا قیامت ان جمع شدہ احادیث سے پوری ملت مستفیض ہو۔ اگر خدا نخواستہ حیات طیبہ کے ۲۳ سالہ روزنامچوں کی تدوین نہ ہوتی تو امت ضیق میں پڑ جاتی اور اس نعمت غیر مترقبہ کے حصول سے کوسوں دور رہتی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی تدوین کی ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں "نئے نئے حالات سے مسلمانوں کا سابقہ تھا۔ تجارت و زراعت اجتہاد مفتوحین و محکومین ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے۔ قدیم عادات و روایات کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں۔ ان میں سے کسی ضرورت کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا اور نہ سرسری طور پر ان سے گزرا جا سکتا تھا۔ علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین سے محروم کر دیتی"
(تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول صفحہ ...)

علامہ شبلی فرماتے ہیں "صرف ہم مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے جس کا نام مبارک محمدؐ ہے۔ یہ صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ علمی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینی اور دنیوی ہے (سیرت النبی جلد اول طبع دوم ص ۶)
اگر محدثین کرام نے جمع و ترتیب احادیث کی کوشش بہ احسن انجام نہ دی ہوتی تو آج ہمارے پاس نہ رسول کا طریق تزکیہ نہ تعلیم کتاب اور دین کی حکمت نہ ہوتا اور بعثت رسول کے یہ مقاصد محض رسول اللہؐ کی زندگی تک محدود ہو کر رہ جاتے اور بعد میں آنے والی نسل ان سے محروم رہتی جس طرح محمدؐ سیدنا ابوبکرؓ و سیدنا عمرؓ کے لئے رسول تھے اسی طرح آپؐ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے بھی رسول تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حضرات محدثین کو جمع احادیث کے لئے معمور فرمایا اور اسی طرح قیامت تک کے لئے امت کا رشتہ اپنے رسول سے جوڑ دیا۔

دور تدوین

مسلمانوں میں اخبار و سیر اور احکام و سنن کی ترتیب و تدوین کے درحقیقت تین دور ہیں۔ عہد اول میں لوگوں نے ذاتی معلومات فراہم کئے دوسرے دور میں پورے شہر کی معلومات یکجا کئے اور تیسرے دور

میں دنیائے اسلام کی معلومات کو دین حق کے جانبازوں نے بڑی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد جمع کیا جو موجودہ دور میں کتابوں کی شکل میں موجود ہیں۔

حضور کے زمانے میں اس کا منظم نہ ہونا

اس میں اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ حضور اکرم کی زندگی تک تدوین قرآن کی طرح باضابطہ اور منظم طور سے احادیث مدون نہیں ہوئی تھیں۔ اور نہ انھیں قرآن کی تدوین کی طرح حیثیت دی گئی۔ اگر شروع زمانے میں احادیث کی تدوین کا فریضہ انجام دیا گیا ہوتا تو لوگ قرآن مجید کی حفاظت کے ساتھ ہی ساتھ احادیث کی حفاظت سے بھی گریز نہیں کرتے اور نیک نیتی کے ساتھ اسے بھی مدون کرتے لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس کا خدشہ تھا کہ لوگ قرآن و حدیث کو گڈمڈ کر دیں گے اور دشمنان دین اور منکرین کو شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موقعہ مل جائے۔ یعنی یہ طریقہ کسی حکمت کے پیش نظر اپنایا گیا تھا اور وہ حکمت یہی تھی کہ قرآن و حدیث میں التباس نہ ہو جائے جیسا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔ فلو دونت السنة كما دون القرآن وهي واسعة كثيرة النواحي شاملة لاعمال الرسول الشرعية واقواله منذ بدء رسالته الى ان لحق بربه للزم اكبابهم على حفظ السنة مع حفظ القرآن (السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی طبع ۲۔ صفحہ ۵۹)

جمع و تدوین میں بلند ہمتی

حضور اکرم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا۔

فليبلغ الشاهد الغائب۔ جو لوگ موجود ہیں وہ غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا۔ تسمعون ويسمع منكم ويسمع ممن يسمع منكم۔ (ابوداؤد) تم لوگ مجھ سے سنتے ہو اور لوگ تم سے سنیں گے پھر جن لوگوں نے تم سے سنا ہوگا ان سے دوسرے لوگ سنیں گے۔ اور ان احکام پر عمل پیرا ہونے والوں کے حق میں یہ دعا کی: نضر الله امرءا سمع مقالتي فوعاها ثم اداها الى من لم يسمعها۔ ایک اور جگہ فرمایا تھا۔ کل امتی یدخلون الجنة الا من ابى۔

ایک طرف تو حدیثوں کی تبلیغ و اشاعت کے لئے کھلا ہوا فرمان اور دوسری طرف سرمدی کامیابی کے لئے یہ تشویق و ترغیب اس کے باوجود حضور اکرم کے ان جاں نثاروں میں حدیثوں کی خدمت کا جذبہ صادق کیوں نہیں ابھرتا۔ حالانکہ انھوں نے معلم اخلاق صلعم کی حدیثوں کو سرمایۂ زیست قرار دے دیا تھا۔ نفس احادیث نبوی سے اس قدر شغف ہو گیا تھا کہ انھوں نے احادیث اکٹھا کرنے کے لئے دنیا کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ ان کی ثبات قدمی اور بادیہ پیمائی کا اندازہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ان جملوں سے ہوتا ہے "امام بخاریؒ نے ۱۴ برس کی عمر میں سیاحت شروع کر دی تھی۔ بخارا سے مصر تک انھوں نے سارے ملک کھنگال ڈالے۔ امام ابوحاتم رازیؒ کہتے ہیں کہ میں نے تو ہزار میل سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی پھر میں نے میلوں کا شمار چھوڑ دیا۔ محدث اندلس ابن حیوان نے علم حدیث، اندلس، عراق، حجاز اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کیا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت ج ۱ ص ۶۷) اور بخاری میں حضرت ابوذر کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "اگر تم میری گردن پر تلوار رکھ دو اور مجھے یہ بات کی امید ہو کہ میں مرنے سے پہلے رسول اللہ کا ایک کلمہ بھی جو میں نے سنا ہے پہنچا سکوں گا تو میں ضرور کہہ دوں گا" (کلام نبوت صفحہ ۱۵۱)

امام زہریؒ نے حدیث و روایت کے لئے اس قدر مشقتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصار کے گھر جاتے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد جو مل جاتا حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں تک سے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و حالات پوچھتے اور قلم بند کر لیتے (دلائل السنن والآثار)

ابتدائے کار اور صحابہ کرام

تفصیلی بحث کو منظر عام پر لانے کی بجائے اس کار عظیم کے آغاز کے سلسلے میں ایک حوالہ دینا کافی سمجھتا ہوں، جو علامہ عبداللہ العمادی کی تالیف "علم الحدیث" کے صفحہ ۲۴ — ۲۵ میں مذکور ہے۔ حضرت عائشہ کے بھتیجے قاسم ابن محمد حضرت ابوبکر سے متعلق ام المومنین حضرت عائشہ کا بیان نقل کرتے ہیں۔ قالت عائشة جمع ابي الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانت خمس مائة

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

ابوبکر صلاحی استاذ جا

جمہوری طریقہ انتخاب

٦

سب سے بڑی خامی — امیدواری سسٹم

جو شے سراپا خرابی اور مجسم شر ہو اسکے کسی ایک جزیا شعبے کے بارے میں خیر و خوبی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے اگر شراب کی پوری بوتل ناپاک ہے تو اس کا ایک قطرہ کیسے پاک ہو سکتا ہے اگر خنزیر مجسم نجاست ہے تو اس کے کسی ایک عضو کو کیسے طیب و طاہر کہا جا سکتا ہے، اگر نظام اشتراکیت مجموعہ شر و فساد ہے تو اس کا کوئی ایک حصہ کیسے مفید و کارآمد ہو سکتا ہے اور اگر نظام جمہوری مجموعہ اغلاط ہے گویا "ظلمات بعضہا فوق بعض" کا مصداق ہے تو اس کا کوئی ایک شعبہ کیسے درست اور صحیح ہو سکتا ہے لہذا جمہوری انتخابات میں امیدواری سسٹم کی غلطی اور نادرستگی میں شک و شبہ کی کہاں گنجائش ہے۔ البتہ یہ بتانا ضروری ہے تاکہ آپ پر عیاں ہو جائے کہ جس شاخ پر آپ آشیانہ بنا رہے ہیں وہ کتنی ناپائیدار ہے اور جس سمت سے آپ اپنی تشنگی بجھانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں وہ سراب اور دھوکا ہے۔

غلط اور بے بنیاد نظریہ | جمہوریت کی ابتدا ہی ایک غلط اور بے بنیاد نظریے سے ہوتی ہے یعنی یہ کہ یا تو اس دنیا کا کوئی خالق اور مالک ہے ہی نہیں جسکی ہدایت و رہنمائی کے ہم محتاج ہوں یا اگر ہے تو اسکا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے اجتماعی زندگی اور اس کے معاملات میں ہم اسکی ہدایت و رہنمائی سے بالکل بے نیاز ہیں اور یہ دونوں ہی صورتیں نتیجۃً برابر ہیں۔ اس لئے کہ اجتماعی زندگی مذہب کی گرفت سے نکل جانے کے بعد انفرادی زندگی میں بھی مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور مذہب خدا اور بندے کا "پرائیویٹ معاملہ" بھی نہیں رہ جاتا ہے۔ ذہن اور فکر کو مذہب اور خدا سے آزاد کرنے کے بعد نظام جمہوری انسان کو غیر مشروط طور پر حق حاکمیت عطا کرتا ہے اور قانون سازی کا اختیار بھی اسی کے حوالے کرتا ہے اور قانون سازی کی مہم سر کرنے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے افراد کے انتخاب کیلئے اس نے امیدواری سسٹم جاری کیا جو آج ہمارا موضوع بحث ہے۔

کسی مافوق الفطرۃ ہستی کے وجود کو تسلیم کرنے اور پھر زندگی کے معاملات میں اس کے احکام کو ماننے سے بے نیازی اور آخرت کی جواب دہی کے تصور سے خالی ہو جانے کے بعد انسان کا منتہائے مقصود یہی دنیا اور اس کے حقیر فائدے رہ جاتے ہیں اور حصول دولت و شہرت اور اقتدار کو سب سے بڑی کامیابی خیال کیا جاتا ہے۔

امیدواری کے لوازمات | جب منزل مقصود یہی

چیزیں ٹھہریں تو انتخابات کے اعلان کے بعد خاموش کیسے رہا جا سکتا ہے، چنانچہ دولت کے حریص شہرت کے لالچی اور اقتدار کے بھوکے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اگر وہ کسی جماعت یا پارٹی سے وابستہ ہیں تو خدمت ملک اور قوم کے نام پر امیدواری کا ٹکٹ حاصل کرتے ہیں اور یہ جذبۂ خدمت — بظاہر یہی کیا جاتا ہے — اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ اگر اپنی محبوب جماعت کی طرف سے ٹکٹ حاصل نہیں ہوتا تو اس سے بغاوت کر کے آزاد امیدواروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا لیا جاتا ہے۔ پھر وہ سب کچھ ہوتا ہے جسے ایک شریف آدمی ہرگز ہرگز گوارہ نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ کسی شریف آدمی کے وہم و گمان میں بھی الیکشن میں کھڑے ہونے کا خیال نہیں آتا۔

امیدواری کی فہرست میں نام آجانے کے بعد کامیابی کے لئے پوری کوشش کی جاتی ہے اور مخالف کو ہر طرح سے زک دینے کی جدوجہد ہوتی ہے امکان بھر ان کے خلاف کیچڑ اچھالا جاتا ہے اور مخالف کے حصے عیوب و نقائص کا ایک پہاڑ ووٹروں کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے اور اپنی خوبیوں، اچھائیوں اور آئندہ کارگزاریوں کا حسین قصر — مگر درحقیقت سراب — انھیں چشم تصور سے دکھایا جاتا ہے اور ضرورت پڑے تو بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور دولت کا یہ بے دریغ خرچ اور گراں قدر رقم پر ووٹوں کی خرید اس لئے نہیں ہوتی کہ ان کو قوم سے محبت ہے اور اسکی خدمت کا موقع تلاش کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ کامیابی کے بعد اصل مع سود کے واپس کر کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابی نے جہاں ان کے قدم چومے وہ تمام وعدے جو قوم سے کئے گئے تھے فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اصل مع سود در سود کے حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اب بیچارے عوام کو پتہ چلتا ہے کہ کس طرح فریب میں مبتلا کئے گئے تھے مگر "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔ جس زمانہ میں انھیں اپنا نمائندہ منتخب کرنا تھا اس وقت تو امیدواروں نے اپنے طوفان بدتمیزی سے اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ سنجیدگی سے سوچ سکیں کہ کس سے خیر کی امید کی جائے اور اب ہاتھ سے تیر نکل چکا۔

ایک اور موقع

لیکن نہیں، موقع پھر آنے والا ہے —

مگر — کیا اس وقت امیدواران ان کے دماغی سکون نہ چھین لیں گے؟ اور کیا ان کو سنجیدگی سے غور و فکر کا موقع ملیگا؟ اور اگر وہ سنجیدگی سے غور کریں اور کسی نیک نفس کو اپنی نمائندگی کے لئے موزوں پائیں تو پھر کیا حاصل؟ جبکہ شریف اور نیک اشخاص کو اس طوفان بدتمیزی میں اٹھنے کی جرات نہیں ہو سکتی اور جمہوری الیکشن میں امیدواری ضرور ہے، لامحالہ ووٹ انھیں مفاد پرستوں میں سے کسی ایک کو دینا ہوگا جو امیدوار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں، یا پھر خاموش ہو کر بیٹھ رہا جائے مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں اس لئے کہ انھیں مفاد پرستوں میں سے کوئی کامیاب ہو کر رہیگا۔

یا للعجب! اس قدر مجبوری، بے چارگی! ایک طرف تو جمہوریت کے علمبردار بلند بانگ دعووں کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ نظام جمہوری میں آزادی رائے حاصل ہے دوسری طرف قدم قدم پر ایسی پابندیاں جس سے آزادی کا خون ہوتا ہو۔ ایک طرف تو یہ خوش کن لے کہ ہر ایک کو آزادی ہے کہ اپنا ووٹ جس کو چاہے دے اور دوسری طرف یہ قید کہ ووٹ کا حقدار

دی ہے جسے امیدواری کی سند اجازت ملے تو زمین کا
ہو، ایک طرف لوٹ کھسوٹ جائز اور حق دار پر کوئی
دباؤ نہیں، دوسری طرف ایجنٹوں اور رہزنوں کو ڈاکہ
ڈالنے کی پوری اجازت۔ غرض کہ اندر ساری خرابیاں
موجود ہیں اگرچہ انھیں الفاظ کے خوشنما پردوں سے
ڈھکنے کی پوری کوشش کی جاتی رہی ہے، لیکن
حقائق کو غلط بیانیوں کے پردوں میں زیادہ دنوں تک
نہیں چھپایا جا سکتا ہے، چنانچہ اندر چھپی ہوئی ساری
غلاظتیں آج ظاہر ہو چکی ہیں اور دنیا اس کے تعفن سے
پریشان ہو چکی ہے۔

اسلام کا طریقہ انتخاب

اب آئیے دنیا کو ذرا حقیقی
حریت سے آشنا کرنے والے نظام حیات "اسلام"
کا جائزہ لیں کہ وہ اس سلسلے میں ہماری کیا رہنمائی
کرتا ہے۔ نظام اسلام امیدواری کو سرے سے ناجائز
قرار دیتا ہے اور لوگوں کو اس بات کی پوری آزادی دیتا
ہے کہ سنجیدگی سے غور کریں کہ جس کام کیلئے وہ کسی کا
انتخاب کرنے والے ہیں اس کے لئے کون سا شخص
موزوں ہے پھر چاہے وہ اس سے انکاری کیوں نہ ہو
اسے ووٹ دیں گے اور اس کا انتخاب کریں گے اس سے
دو فائدے حاصل ہوتے ہیں ایک یہ کہ سکون
و سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔
اور جھوٹے پروپیگنڈے اور غلط ہتھکنڈے اسکی
رائے پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ دوسرے امیدواری
سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب محدود
نہیں کر دی جاتی بلکہ پوری وسعت ہوتی ہے کہ جسے
چاہیں منتخب کریں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ
امیدواری وطلب فساد کی جڑ ہے جیسا کہ میں
نے بتایا ہے اور جس کا مزید اندازہ تھوڑے غور وخوض
سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام میں عہدوں کے
طلب کی سخت ممانعت ہے اور جس کے متعلق معلوم
ہو کہ کسی عہدے کا خواہشمند ہے اس کو کبھی بھی وہ عہدہ
نہیں دیا جا سکتا، جیسا کہ خود داعی اسلام علیہ الصلاۃ والسلام
نے فرمایا کہ:

"خدا کی قسم ہم اس حکومت کے منصب پر کسی شخص کو مقرر
نہیں کرتے جو اس کا طالب ہو اور نہ کسی ایسے شخص
کو جو اس کا حریص ہو۔"

(بخاری ومسلم)

اس لئے کہ جو شخص کسی عہدے کو طلب کرتا ہے
ظاہر ہے کہ وہ اپنی کسی غرض کے لئے کرتا ہے ورنہ اس
عہدے کی بھاری ذمہ داریوں کا احساس ہوتا تو
وہ عہدہ کبھی طلب نہ کرتا، پس جب طلب عہدہ میں
کوئی غرض پنہاں ہوگی تو ضرور ہے کہ وہ خدا کی اعانت
اور اسکی توفیق سے محروم رہے گا اور اس محرومی
کے بعد بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کیلئے مفید ہو
مضر ہوگا۔ اسی لئے آنحضورؐ نے فرمایا:

"حکومت کی طلب نہ کرو کیونکہ اگر وہ تجھے بے
طلب دی گئی تو خدا کی طرف سے تیری مدد کی
جائے گی اور وہ تیرے مانگنے سے دی گئی تو
تجھ کو اسی کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

(بخاری ومسلم)

اور جب صورت یہ ہو تو کوئی بھی صالح آدمی عہدہ
کی طلب نہیں کر سکتا بلکہ اس کے نزدیک اگر کوئی
شے ناپسندیدہ تر ہو سکتی ہے تو یہ طلب عہدہ ہوگی
جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا:

"تم لوگ ایسے شخص کو بہترین اشخاص
میں سے پاؤ گے جو حکومت کے منصب

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

(بقیہ درس قرآن صفحہ ۵ سے آگے)

میں اس سے ملاقات کی تمنا اور شوق ہونا چاہیے یہ کیسی بات ہے کہ بادشاہ کی سے تم محبوبیت کا دعویٰ کرتے ہو اور کہتے ہو وہ بھی تم کو محبوب رکھتا ہے لیکن اس سے ملاقات سے کتراتے ہو۔

چونکہ حقیقت اس کے برعکس تھی اسلئے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے اور ان کا انجام کیا ہوگا یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے

یہ ان بہت سے امراض میں سے ایک مرض ہے جس میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے اور جنہوں نے اندر ہی اندر ان کو چاٹ کر ختم کر دیا نتیجہ وہ اس لائق نہ رہے کہ منصب امامت پر فائز رہیں۔ اللہ نے انہیں کے بھائیوں میں سے ایک رسول اٹھایا اور ایک دوسری قوم کو دنیا کا امام اور پیشوا بنا دیا۔ اور یہ چودہ سو سال سے یہ امت اس بات کی ذمے دار ہے کہ دنیا کے اندر نیکیوں کو فروغ دے اور برائیوں کا قلع قمع کرے کیا یہ امت اپنے فرائض کو ادا کر رہی ہے

(صفحہ ۱۶ سے آگے بقیہ مدینۃ النبی)

جھولی بھر دونوں ہاتھوں سے ہر صبح و شام بھر۔ یہاں سے ہر شخص کو خدمت خاص ملتی ہے کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں۔ یہ رحمۃ اللعالمین کا دربار ہے سورج کا ہے گو یہ سب پر یکساں چمکتا ہے ہوا گناہ گاروں کے لئے رک نہیں جاتی وہ سب کے لئے مشام جاں ہے خوشبو پھیلانے کے لیے چشمے کسی کے لئے اپنے سوتے نہیں موڑتے وہ سب کے لیئے رواں دواں ہیں لوگ آتے اور تشنگیاں مٹا کر چلے جاتے ہیں۔ اب رواں نے کسی تشنہ لب سے کبھی اس کی ذات پات نہیں پوچھی ہمیشہ ظروف بھر دیتے ہیں آخر وہاں پہنچ گیا جہاں پہنچنے کے لئے آیا تھا روضہ مبارک کے روبرو۔

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا نبی اللہ

تین پیر صفوی جھروکوں میں سب سے پہلا جھروکہ سرور کونین کا ہے دوسرا ابوبکرؓ کا تیسرا عمر فاروقؓ کا، جانے کتنی دیر گم سم کھڑا رہا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ انسانوں کا تانتا بندھا ہے اور سب اشکبار ہیں، اس حد تک محو ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی آگاہ نہیں، لوگ آرہے اور جارہے ہیں پہرے دار کھڑے ہیں راستہ بن رہا ہے خلقت نکل رہی ہے اور دعائیں لٹ رہی ہیں شمع روشن ہے پتنگے جمع ہیں گھٹتے ہی نہیں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور لو ہیں کہ جلے جا رہے ہیں دعائیں دہرا دہرا کے ختم ہو گئیں سلام و درود نذر ہوتے رہے وہ مزاجہ مواجہ پر تھا ہر آن پڑھتا گیا۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ کا امیدواری سسٹم)

سے سخت کراہت رکھتا ہو یہاں تک کہ وہ مجبوراً اس میں مبتلا ہو جائے۔

(بخاری و مسلم)

ان احادیث کی روشنی میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے کس طرح ان مفاسد کی جڑ کاٹ دی ہے جو طلب عہدہ سے پیدا ہوتے ہیں اور جو افراد کو جوڑنے کے بجائے ان میں کینہ و حسد اور بغض و عداوت کا بیج بوتے ہیں اور پھر معاشرے کو نیم تناہی کشمکش میں مبتلا کر کے ان کی زندگی سے سکون و اطمینان چھین لیتے ہیں اور اس کا اندازہ نیز جو باتیں میں نے پہلے بیان کیں الیکشن کے بعد کے حالات سے ہر مقام پر لگایا جا سکتا ہے۔

اقتباس

تحریک اسلامی اور مغربی تہذیب

مغربی تہذیب کے سلسلہ میں اسلامی تحریک کا موقف شروع ہی سے بہت واضح رہا ہے۔ تحریک اسلامی نے اس تہذیب کے عیوب کو نمایاں کیا، اس کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ کیا اور اس کی حقیقت کا پردہ پوری طرح چاک کیا ہے۔

تحریک نے بہت واضح لفظوں میں بتایا کہ یہ تہذیب جو اپنی علمی جلال کی بدولت ایک عرصہ تک دنیا کو چکا چوند کرتی رہی ہے، اور جس نے ساری دنیا کو اپنے علمی انکشافات کی بدولت زیر کر رکھا تھا، اب افلاس و درماندگی کا شکار ہے۔ اور رو بہ زوال ہے۔ اس کی بنیادیں ہل رہی ہیں۔ اور اس کے قوانین و نظام کا ڈھانچہ منتشر ہو رہا ہے۔

وہ ممالک جنہوں نے مارکسی اور اشتراکی نظریات کا تجربہ اپنے یہاں کیا ہے۔ اور کر رہے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں پریشانیوں اور تنگیوں کا شکار ہیں۔ ان ممالک میں مہنگائی کی دشواری، طبقاتی کشمکش کی دشواری، جملہ وسائل و ذرائع کو قومیانے کی دشواری، اور دیگر مشکلات و مسائل اشتراکی نظریہ و نظام کی ناکامی کا کھلا اعلان ہے۔

اس طرح وہ ممالک جو آزاد معیشت اور آزاد معاشی نظام کا تجربہ اپنے یہاں کر رہے ہیں۔ وہ خود بھی اجتماعی و اقتصادی مشکلات کے طوفان میں گھرے ہیں، ذخیرہ اندوزی، بے روزگاری، سود کی لعنت، جیسی خرابیوں کے شکار ہیں۔

آج ساری دنیا ان غیر فطری نظاموں اور منحرف مادی نظریات کی بدولت اس کشتی کے مثل ہو گئی ہے جو سمندر کے اندر طوفان میں گھری ہچکولے کھا رہی ہے۔ جس کے ملاح عاجز ہو چکے ہیں۔ طوفانی ہوائیں چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے ہیں پوری انسانیت ان نظاموں کے تحت عذاب میں مبتلا ہے۔ اور سامراجی نظاموں کی آگ میں جھلس رہی ہے۔ یہ انسانیت اسلام کے چشمہ شیریں کی محتاج ہے، جو بدبختی اور شقاوت کی غلاظتوں کو صاف کر کے اسے فلاح و سعادت کی مسرت سے ہمکنار کرے۔

اسلام۔ نظریہ تحریک اور انقلاب

(بقیہ تدوین حدیث صفحہ ۱۹ سے آگے)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد نے رسولؐ کی پانچ سو احادیث جمع کیں، جو صحابہ کرامؓ آسمان کے تاروں کی سی حیثیت رکھتے تھے جن کی تعریف قرآن میں جا بجا کی گئی ہے۔ ان کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ حضور اکرمؐ کے فرامین کو نظر انداز کر کے آپ کی پیروی سے محروم رہ جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب احادیث میں حفظ حدیث کا حکم دیا گیا اور کامیابی کی بشارتیں دی گئیں تو ان کی سرگرمیوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ مثلاً ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ وہ حضورؐ کے زمانے میں کم سن تھے۔ بعض بڑی عمر کے صحابہؓ کے دروازے پر پہنچ جاتے اور دوپہر تک صرف اس غرض سے بیٹھے رہتے تھے کہ رسول اللہؐ کی کوئی بات بیان کریں تو یہ نوٹ کر لیں۔ (دارمی ”دلائل السنن والآثار“) اس گروپ کے سرخیلوں میں صرف حضرت ابوبکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت علیؓ ہی نہیں تھے۔ بلکہ عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن عمروؓ، جابر بن عبداللہؓ، انسؓ بن مالک، معاذؓ بن جبل، ابوذر غفاریؓ، رضی اللہ علیہم اجمعین جیسی مقتدر ہستیاں بھی تھیں۔

ہفت روزہ چٹان لاہور کے بانی آغا شورش کاشمیری

"مدینۃ النبی میں"

جذب و عشق میں ڈوبی ہوئی ایک تحریر

گنبد خضرا روبرو تھا "گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں"
جہاں کبھی ابو ایوب انصاری کا مکان تھا اور رسول اللہ ﷺ کا
ناقہ میزبانی کا شرف بخشنے کے لئے بیٹھ گیا تھا وہاں جنت البقیع
کو جاتی ہوئی سڑک پر سیارہ رک گیا، باب عمر، باب عبدالمجید
اور باب عثمان کی سڑک پر قصر الحجاز ہوٹل ہے۔ یہاں ہم دو
کمرے لے کر ٹھہر گئے کوئی دس منٹ میں نہا دھو کر کپڑے
بدلے، بالکونی سے جھانکا تو نگاہیں گنبد خضرا سے ہم آغوش
ہو گئیں، اس وقت کبوتروں کی ٹکڑی نے ہالہ باندھ رکھا تھا
آرام گاہ نبوت میں کورنش بجا لا رہے اور تحریری عرض کر رہے
تھے۔

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا، کیا واقعی مدینۃ النبی میں ہوں؟
یا خواب دیکھ رہا ہوں، مجھے اپنے موجود ہونے کا احساس ہو
گیا۔ سلام ہو اے مدینۃ النبی تو کائنات کی فخر و ناز کی پونجی ہے
تیری بنیادیں صبح قیامت تک قائم و دائم ہیں۔ تو نے
وہ شرف حاصل کیا جو کرۂ ارض پر کسی خطے کو حاصل نہیں اور
نہ حشر تک کوئی اس سعادت سے مشرف ہو گا۔

تیری آغوش میں ایک ایسا انسان سو رہا ہے جو اپنے وطن سے ہجرت
کر کے یہاں آیا۔ تو نے اس کو پناہ دی، اس کی میزبانی کی۔ پھر وہ
تیرا ہو گیا۔ تیری مٹی کو اس نے اپنے وجود سے زندہ جاوید
کر دیا۔ تیرا نام اس کا ہو گیا۔ یہاں ڈنکا بالا کیا اور وہ امام تھا
کہ صدیوں سے انسانوں کے قافلے صبح و شام تیری طرف کھنچے
چلے آتے ہیں۔

تیری فضاؤں میں قرن ہا قرن سے درود و سلام کے موتی
بکھر رہے ہیں۔

تیرے ہاں حاضر ہونا دنیا کی عظیم سعادتوں میں سے
ایک سعادت ہے سب سے بڑی سعادت

آج قریب چودہ سو برس ہوتے ہیں تیری کوئی ساعت
کوئی ثانیہ درود و سلام سے خالی نہیں رہا۔

تیری گلیاں ہم ایسوں کے لئے مصری کی ڈلیاں اور
گلاب کی کلیاں ہیں۔

تیرے ذرے مہر و ماہ کو شرماتے ہیں اور دل و نگاہ
کو چمکاتے ہیں۔

تیری ہواؤں میں انفاس رسالت کی خوشبوئیں بسی
ہوئی ہیں۔

تو کتنا حلیم و کریم ہے کہ ہم ایسوں کو بھی حاضری کی
سعادت بخشتا ہے۔

تیری عزت بے پایاں اور تیری عظمت بیکراں ہے۔
تو دریائے کرم ہے کہ ہر فرد بشر تیرے یہاں آ کر اپنی
پیاس بجھاتا ہے۔ تو آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور ہے۔
اے کرۂ ارض کے سرتاج! اے سرتاج الانبیاء کی

آرام گاہ ، ایک انسان کی بدولت کروڑوں انسانوں کو زندگی بخشنے والے ، اے کلام اللہ کے ۷۷۴۳۰ کلمات اور تین لاکھ ۲۳ ہزار سات سو ساٹھ حروف میں سے مدنی آیتوں کے جائے نزول ، اے اس آخری نبی کے مدفن مبارک جس کی ذات اقدس پر ۲۲ سال ۵ ماہ کے عرصہ میں ۶۶۶۶ آیتیں نازل ہوئیں ، اے رحمتوں ، فضیلتوں کے شہر ، اے عظیم انسانوں کے مامن ، اے زبان و بیان کی روح رواں ، اے سپہ سالاروں کے دل کی دھڑکن ، اے انشاپردازوں کے علو فکر ، اے شاعروں کے تخیل کی معراج ، اے خطیبوں کے ولولۂ خطابت کی آبرو ، اے عالموں کے افکار کی آرزو ، اے دانشوروں کے علم و حکمت کی جستجو ، اے اہل اللہ کے آستانۂ آخر ، اے عابدوں کی جبیں کے ناز ، اے زاہدوں کی محبت کے محور ، سجود و سخا کے تحریک ، اے جمال دولت کے مسکن ، اے گناہ گاروں کی بخشش گاہ ، اے بلدۂ رسالت پناہ اے مرکز دل و نگاہ اے انس و ملک کی بوسہ گاہ ، اے خطاکاروں کے خدا کی ، اے ہر عہد کے فضلاء کی منزل ، اے عاشقان صادق کے محل ! ایک ہیچ مداں اور بے سروسامان کا سلام قبول کر۔

اے مدینۃ النبی تو مرکز انوار الٰہی ہے ، تو نے سب زمانوں کی غایت اعلیٰ کو دیکھا اور جاوداں ہو گیا ۔ اللہ نے تجھے ہمیشگی بخشی فرشتے اللہ کے عرش سے تیرے فرش پر سلام و درود کے تحفے لاتے ہیں ۔ تو نے اسلام کو رونق بخشی اور تاریخ کو عزت دی ۔ تو نے ادب کو درخشاں کیا ، تو نے قلم کو توانائی ، زبان کو رعنائی ، بیان کو زیبائی اور فکر کو گہرائی بخشی ہم تیرے اور تو ہمارا ہے ۔ تیری گلیوں میں سیر کا سوز دروں اور انصاریوں اور مہاجرین کا جوگ جنوں ہے ۔ شب زندہ داروں کی بلا واسطہ حکایت کو پیر مکنون ہے ۔ تو خوشی سے نازک تر ہے تیرے آغوش میں اسلام سو رہا ہے تیری مٹی پاتال تک مقدس ہے ۔ تو سب سے بڑی تاریخ ہے تیرے شہاں میں احد ہے جس نے بقول ابوالحسن علی ندوی نے جنت کو شجاعت کے لئے بے شمار الفاظ دیئے ہیں ۔ وہ پہاڑ جو قیامت کے روز جنت میں اٹھایا جائے گا ، تیرے مشرق میں جنت البقیع ہے جہاں وہ لوگ سو رہے ہیں جو ابدالآباد تک زندہ ہیں جن کے لئے موت نہیں ، جن سے موت بھاگتی رہی اور ہمیشہ کے لئے بھاگ گئی ۔ جن کے چہرے کی پیشانی نے عرش و فرش سے سلام لئے ہیں ۔ جو صرف زندہ رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جن کا عقیدہ تھا کہ موت زندگی کی ابتدا ہے اور وہ مر کے زندگی کی ابتدا کر گئے وہی زندگی تب سے اب تک رواں دواں ہے ۔

سلام ہو اے مدینۃ النبی ...... سلام ہو
اے شہروں کے شہنشاہ
اے انسانوں کی امیدگاہ
اے زیر فلک عالم پناہ ...... سلام ہو

وہ گھبراہٹ جو کہ اپنی روسیاہیوں کے باعث مسجد نبوی میں داخلے کے تصور سے پیدا ہو گئی تھی یکایک ختم ہو گئی ۔ بیت اللہ میں جلال ہی جلال تھا ۔ مسجد نبوی میں جمال ہی جمال معلوم ہوا جیسے کوئی آغوش کھل گیا ہو ۔ فخر و مسرت کا ایک عجیب احساس طاری ہو گیا ۔ باب عمرؓ یا مجیدی اور باب عثمانؓ سے باہر کا فرش سنگ مرمر دروازوں کے سامنے بچھا ہوا ہے وہاں تمام دن کبوتروں کی ٹکڑیاں اڑتی اور بیٹھتی رہتی ہیں ۔ یہاں بدووں کے بچے گیہوں کے لفافے لئے صدا دیتے ہیں ، عقیدت مند لفافے خرید کر دانے بکھیر دیتے ہیں ۔ کبوتر اڑ اڑ کے دانے چگتے ہیں اور دور دور کے چکر کاٹتے ہیں ۔ ہمارے یہاں انسانی ہاتھ کے خدشے سے کبوتر اترتے ہوئے جھجکتے ہیں ۔ لیکن یہاں انھیں کوئی خدشہ نہیں وہ آپ کے آس پاس اڑتے پھرتے اور چگتے ہیں ۔ ان کی طرف بڑھیں تو وہ پرواز کا دائرہ بنتے اور پھر پھر کیلیتے ہیں ۔ ہم داخل ہوئے تو نماز عصر کی صفیں کھڑی ہو رہی تھیں اور یہ پہلی نماز تھی جو حرم نبی میں ادا ہو

رہی تھی، ظاہر ہے جو درجہ نماز کا یہاں ہے وہ مسجد الحرام کے سوا اور کہیں نہیں۔ خود حضور رسالت مآبؐ یہاں بارگاہ ایزدی میں جھکتے رہے ہیں۔ یہاں کی ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ یہاں ہر ذرہ جنت ہے۔ جنت اور کیا ہوگی کہ سامنے رسول خدا سو رہے ہیں۔ کوئی لمحہ درود وسلام اور سجدہ و تکبیر سے خالی نہیں۔ یہ تسبیح و تہلیل، قرآن و حدیث، ذکر و اذکار، نوافل و وظائف اور دعا و صفا کی دنیا ہے۔ اسکی بنیادیں وہی ہیں جو رسول اللہؐ نے اٹھائی تھیں۔ اس کی روح رسول اللہ کی روح ہے۔ امہات المومنین کی حیا چاروں طرف محیط ہے، صحابہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور اہل بیت بولتے چلتے ہیں۔ صرف محسوس کرنے کی ضرورت ہے اور احساس کسی کسی کو ملتا ہے۔

نمازیں کعبۃ اللہ کی ہوں یا مسجد نبوی کی، طویل نہیں ہوتیں۔ ہمارے یہاں کے مسجدوں کے امام طول کھینچتے ہیں لیکن حرمین میں ہر نماز اختصار سے ہوتی اور خشوع و خضوع پیدا کرتی ہے۔ کعبۃ اللہ میں محسوس ہوتا کہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ مسجد نبوی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ کا رسول دیکھ رہا ہے۔ وہ شور و شغف نہیں جو ہمارے یہاں مسجدوں میں نماز کے بعد عام ہوتا ہے۔ ایک عجیب سکون ہے جو نماز سے پہلے نماز کے دوران اور نماز کے بعد چھایا رہتا ہے۔ بعض حلقوں میں درس و حدیث ہوتا ہے اور اس پر حق ہے مختلف ممالک کے علماء حلقہ باندھ کر درس دیتے ہیں۔ ہمارے واعظ قرآن و سنت پڑھانے سے زیادہ اپنے علم اور گلے کی دھاک بٹھاتے ہیں لیکن حرمین میں اللہ اور محمدؐ کی دھاک بیٹھی ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ عجز و لاچاری ہے یا سجدہ و گداز۔ یہاں کوئی افسر نہیں کوئی حکومت نہیں کوئی شاہی نہیں، کوئی دولت نہیں، یہاں وہی سب سے زیادہ اکڑ والا ہے جو سب سے زیادہ عاجز ہے —

بیت اللہ میں عقیدہ حاضر ہوتا ہے اور جبین جھکتی ہے حرم نبیؐ میں عشق لے جاتا ہے اور دل جھکتے ہیں۔ دل میں اللہ اور رسولؐ ہیں تو آزمائیے یہاں حاضر ہونا بڑا مشکل ہے۔ نفس پہلا سوال کرتا ہے کہ آستانہ محمدؐ پہ حاضر ہونے والے یہ ہونا کہاں سے آیا ہے، یہاں تو بڑے بڑے رہ جاتے ہیں۔

محمدؐ کے روبرو کھڑا ہونا آسان بات نہیں ہے،
ادب کی تاب جاں نثاران محمدؐ میں کہاں تھی۔

اب جو ساتھی آگے بڑھنے لگے تو میں رک گیا۔ نہیں تو یہاں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ سال بھر میں کئی کئی حاضریاں دیتے ہیں۔ میں کیا! میری بساط کیا؟ ایک مجموعہ فسق، مجھ میں یہ بال و پر کہاں سے آگئے کہ اللہ کے یہاں چلا آیا؟

بہت ہمت کی، قدم اٹھتے ہی نہیں۔ ایک سیاہ کار کا رسولؐ اللہ کے روضہ اقدس پہ حاضر ہونا بہت بڑی جسارت ہے۔ میں اس حد تک تو پہنچ گیا جہاں تک (۱۶) برس میں توسیع ہوئی تھی اس سے آگے جو قطعہ مقفود تھا، ہاتف نے کہا رکو نہیں، یہاں رک گیا تو کہیں کا نہیں رہے گا۔ ستون ابولبابہ کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا کہ حضورؐ حجرۂ عائشہؓ میں فروکش ہیں، جس نے اپنے تئیں بندھا ہوا پایا، حضورؐ بلائیں تو آگے بڑھوں، ان کی طرف سے بندش ڈھیلی نہ ہوگی تو ہلوں گا کیونکر؟ دل نے کہا بڑھ دھرنا لاتقنطوا کے نالائق، روسیاہ جب تک اس در پہ کھڑا نہ ہوگا یہ روسیاہی نہیں دھلے گی یہ داغ نہیں مٹیں گے۔ پاگل ان سے مایوس ہوتا ہے جو مایوسی دور کرنے آئے ہیں "لاتقنطوا" کا مژدہ کون لایا..... وہی تو لائے، مجھے اب نفس کا نخرہ دکھا رہا ہے؟ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ندامت کا غلبہ ہے ہمت جواب دے گئی ہے۔ نفس کی فریب کاری نا کے چشمے پہ تشنگی مٹانے پہنچا ہے، اور اب لب خشک لئے کھڑا ہے، بڑھو آگے اور کھڑا ہو جا ان کے سامنے، جو ہر جہاں کی رحمت ہے، ان کا دروازہ کھلا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

عبدالحی فاروق

کمیونزم کی فکری بنیادیں

موضوع کے تحت سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کمیونزم کی تعریف کیا ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم تقریباً مترادف الفاظ ہیں اور ان دونوں میں بہت خفیف سا فرق ہے۔ دونوں کے مقاصد ایک ہیں اور طریقہ کار میں معمولی سا فرق ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں کمیونزم کی تعریف یہ دی گئی ہے۔

A theory of society according to which all property should be vested in the community and labour organised for the common benefit[1]

"سماج کا ایک ایسا نظریہ جس کی رو سے تمام ملکیت معاشرہ میں تفویض ہونی چاہئے اور محنت کی تنظیم مفاد عامہ کی خاطر ہونی چاہئے۔"

سوشلزم کی تعریف آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق یہ ہے
A theory or policy of social organisation which advocates the ownership and control of the means of production, capital, land, property etc of the community as a whole and their administration or distribution in the interests of all.[2]

سماجی تنظیم کا ایسا نظریہ یا مسلک جو تمام وسائل پیداوار پر پورے معاشرے کی ملکیت اور اجتماعی تصرف کا مدعی ہو اور جس کا مقصد سب کے مفاد میں ان وسائل کی تنظیم اور تقسیم ہو۔

ان دونوں تعریفوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم میں بنیادی حیثیت سے کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ [illegible] کیرو ہنٹ (Crew-Hunt) لکھتا ہے "جہاں تک ان مقاصد کا تعلق ہے جو ان دونوں کے سامنے ہیں ان کی رو سے سوشلزم اور کمیونزم تقریباً باہم مترادف اور متبادل اصطلاحات ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی اختلافات ہو وہ اصل مقصد اور منشا کے اعتبار سے ایک ہیں۔ فرق ذرائع کا ہے، مقاصد کا نہیں (۳)

مارکس اور اس کے متبعین جو ان دونوں اصطلاحوں میں جو اصولی فرق کرتے ہیں اسے خود مارکس نے پہلی مرتبہ ۱۸۷۵ء میں بیان کیا تھا۔ کہ اس نے کہا تھا کہ اشتراکیت کا اولین یا عبوری دور ہوگا اور دوسرا آخری اور تکمیلی دور۔ اولین دور میں مزدوروں کی آمریت قائم ہوگی، ریاست موجود رہے گی اسکو چلانے والے ہاتھ بدل جائیں گے، اجرت کے تعین میں بھی کارکردگی کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ البتہ قومی ملکیت کا نظام نافذ کر دیا جائے گا اور آہستہ آہستہ دوسری سماجی تبدیلیاں لائے گا۔

> (۱) "روسی فوجیں افغانستان میں اس وقت تک رہیں گی جب تک وہ اسباب رفع نہیں ہو جاتے جن کی بناء پر افغان قیادت نے دعوت دی تھی" (بریژنیف [illegible])

اس عبوری دور کے اختتام پر جو دور قائم ہوگا وہ اصل اشتراکی دور ہوگا۔ اس میں غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے گا، فرد کی کوئی ملک نہیں ہوگی، کوئی ریاست یا آلہ جبر نہیں ہوگا۔ پیداوار کی فراوانی ہوگی، ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا وغیرہ۔ مارکس نے پہلے کو ابتدائی دور یا سوشلزم کا دور کہا ہے جبکہ آخری مرحلہ کو کمیونزم کا آخری اسٹیج کہا ہے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ کمیونزم اور سوشلزم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے تو ہمارے لئے کمیونزم کا مطالعہ

سوشلزم کے نام سے کرنا آسان ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ اصطلاح
میں بھی لفظ مستعمل ہے ۔ جدید انگریزی میں کمیونزم کا لفظ تین
مختلف چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(الف) وہ نظام فکر اور اجتماعی نظریہ جو انفرادیت اور سرمایہ داری
کے مقابلے میں رونما ہوا (ب) وہ عملی اجتماعی تحریک جو سرمایہ دارانہ
نظام کو ختم کرنے اور اشتراکی نظام کو قائم کرنے کے لئے برپا ہوئی۔
(ج) وہ نظام معاشرت جو ان ممالک میں قائم ہوا جہاں اشتراکی تحریک
اپنا مطلوبہ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان تینوں کے اندر
ایک جوہری وحدت پائی جاتی ہے یعنی انفرادی ملکیت کا خاتمہ اور ملی
ملکیت کا قیام"

سوشلزم کا فلسفہ

انسانی زندگی کے دو بنیادی سوالات ہیں۔
ایک یہ کہ انسان کیا ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ اس
کا نظام زندگی کیا ہو؟ پہلے سوال کا مطلب انسان کی حیثیت کا تعین کرنا اور
دوسرے سوال کا مطلب انسانی سماجی زندگی کی نوعیت متعین کرنا ہے۔ پہلے سوال
کا جواب ڈارون پہلے ہی دے چکا تھا اور دوسرے سوال کا جواب مارکس نے
اشتراکی نظریہ معیشت یا [illegible] کو کارل مارکس کے قریب ترین
دوست فریڈرک اینگلز نے اس کی قبر پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا
"ڈارون نے فطرت میں ارتقاء کا قانون دریافت کیا تھا، مارکس
نے یہی قانون انسان کی سماجی زندگی میں دریافت کیا ہے"

مادی تصور کائنات

"فطرت میں ارتقا کا قانون"
کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کائنات اور اس کی تمام موجودات کا موجد
اس دنیا سے ماورا کوئی ہستی نہیں ہے، کائنات مادہ سے پیدا ہوئی
ہے جو کہ ازلی ہے اور اجتماع ضدین پر مبنی ہے چونکہ تناقض
اور تضاد فطری طور پر حرکت کو پیدا کرتے ہیں اس لئے مادہ
خود حرکی ہے۔ اس اصول کو تخلیق انسانی پر اس طرح فٹ
کیا گیا کہ انسان پہلے ایک مادہ تھا، کوئی بیکٹیریا وغیرہ جو
کسی ایسی چیز سے ٹکرایا جو اس کی ضد تھی اور ان دونوں
کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا ہوئی پھر یہ تیسری چیز بھی
کافی عرصے کے بعد اپنی ضد سے ٹکرائی اور ایک چوتھی چیز
پیدا ہوئی۔ اسی طرح تمام ٹکراؤ اور ایک نئی چیز کے وجود کے نتیجے
میں انسان ترقی کرتے ہوئے اس ہیئت میں پہنچا ہے۔ یہی حال
دنیا کی تمام مخلوقات کا ہے اور اس طرح فطرت مسلسل ترقی کے
منازل طے کر رہی ہے۔ انسان ترقی کرکے اپنی ارتقاء کی آخری
منزل کو پہنچ چکا ہے۔ اسی طرح سوشلزم بھی ارتقاء کی آخری
منزل میں کمیونزم کی صورت اختیار کرلے گا۔

فطرت کی ارتقا کا دوسرا قانون اصول نفی ہے (Negation) ہے۔
گیہوں کا ایک دانہ فنا ہوکر اپنے سے سوگنا زیادہ دانے پیدا کردیتا
ہے۔ اسی طرح دیگر مادے بھی فنا ہوکر اپنی مقدار اور کمیت
میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس فنا کے بعد جو چیز وجود
میں آتی ہے وہ پہلے سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ یہیں سے
بقائے اصلح اور البقاء فی الفناء کا اصول نکلتا ہے۔

فطرت کی ارتقا کا تیسرا قانون اصول انقلاب ماہیت ہے
(Transformation) ہے جو کمیتی تبدیلیوں اور کیفیتی تبدیلیوں کی
توجیہ کرتا ہے۔ یعنی جب ٹکراؤ کے نتیجے میں پہلی چیز کی ماہیت
بدل جاتی ہے اس تبدیلی کے بعد وہ چیز کس شکل میں ظاہر ہوتی
اس کا اندازہ اس اصول کے ذریعہ ہوتا ہے۔

(فطرت میں ارتقاء کے یہ تین بنیادی اصول ہیں اور ان
کی رو سے انسان کی جو حیثیت قرار پاتی ہے وہ یہ ہے کہ
انسان کا وجود کسی خاص مقصد کے تحت نہیں ہے بلکہ اضداد
کے اختلافات اور ٹکراؤ سے اتفاقی طور پر اس کا وجود ہوا ہے
اور فطری قانون کے تحت زندہ رہتا چلا جا رہا ہے۔ اس لحاظ
سے اس کی زندگی کا نصب العین بھی نہیں ہے اور یہ بھی گائے
بیل بھینس کی مانند محض ایک باشعور جانور یا معاشی
حیوان ہے) سوشلزم نے پہلے سوال کے جواب میں فطرت
میں ارتقاء کے اس قانون کو من و عن تسلیم کرلیا چنانچہ
اینگلز کہتا ہے "کہ اس کے ذریعہ (نعوذ باللہ) اس کائنات

سے باہر کسی خالق کے تصور کا آخری نشان بھی مٹا دیا گیا ہے۔" ۱۱ دوسری جگہ لکھتا ہے "کائنات کا مادی تصور یہ ہے کہ فطرت کو کسی خارجی آمیزش کے بغیر ٹھیک ویسا ہی سمجھا جائے جیسی کہ وہ ہے۔" ۱۲

اس طرح ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم کی پہلی فکری بنیاد مادہ پرستی ہے۔

پہلے سوال کا جواب ڈارون نے فطرت میں ارتقاء کے نام سے دیا تھا اور مارکس نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ دوسرے سوال "انسانی زندگی کا قانون کیا ہو؟" ـــــ کا جواب مارکس نے پہلے کو بنیاد بنا کر خود ہی دیا اور کہا کہ جس طرح انسان ایک لمبے مادی عمل کے ذریعہ انسان بن گیا اور اس میں کسی مافوق الفطرت ہستی کا کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح اس کی زندگی کا قانون بھی کہیں خارج سے نہیں آئے گا بلکہ یہ کام بھی مادی عمل کے ذریعہ مسلسل انجام پا رہا ہے۔ جس طرح انسان کو اس کے مادی ماحول نے ایک حقیر کیڑے سے مکمل انسان تک پہنچا دیا تھا، اب اس کا معاشی ماحول اس کی زندگی کے صحیح ترین نظام کی طرف لے جا رہا ہے۔"

ڈارون نے حیاتیاتی ارتقاء کی دنیا میں مادہ کو جو مقام دیا تھا، مارکس نے سماجی ارتقاء کی دنیا میں وہی مقام معاشی ذرائع پیداوار کو دیا۔

سوشلزم ایک ہمہ گیر نظام

جب بات زندگی کے قانون تک پہونچ گئی تو ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا سوشلزم ایک مکمل نظام حیات ہے؟ یا یہ محض اقتصادی میدان میں اصلاحات کا علم بردار ہے۔ جیسا کہ بعض افراد اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں سوشلزم کے علم بردار اس کو ایک مکمل نظام حیات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے اپنے سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، تمدنی، سماجی اور فلسفیانہ افکار و نظریات ہیں جو از ابتدا تا انتہا خالص مادی بنیادوں پر قائم ہیں۔ چنانچہ اسویزی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے "جب ہم اشتراکیت کی بات کرتے ہیں تو ایک سماجی نظام کے بارے میں بات کرتے ہیں، محض ایک خاص قسم کے تعلقات ملکیت کے مجموعے سے بحث نہیں کرتے" کراو ہنٹ لکھتا ہے "نیز یہ کہ اس کا نظام ایک مکمل نظام ہے۔ ایسا کلی نظام جس میں انسانی فکر و عمل کے تمام پہلو ایک موثر اور فیصلہ کن اصول پر مبنی ہیں۔ ۱۳" "مارکسزم ایک انقلابی نظریہ ہے ...... موجودہ نظام کا پورا ہیولا، اس کا نظام قانون، فوج، پولیس وغیرہ سب کو یکسر بدل کر پورے سماج کو نئی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔" ۱۴

> "دنیا کی نگاہ اس جانب نہیں گئی ہے روس افغانستان کی آبادی کو ہجرت پر مجبور کر کے در حقیقت انھیں ختم کرنا چاہتا ہے یہ ایک نوعیت کی مردم کشی ہے میں نے روس کی بعض کارروائیوں کو بچشم خود دیکھا ہے۔ ۱۰ اگست کو میں پنجشیر میں تھا (وادی پنجشیر کے مشرق میں واقع ہے) ایک روسی گن شپ آیا اور ۵۰۰ سو خانہ بدوشوں کے قافلے پر آناً فاناً گولیاں برسا اور گولے پھینک کر چلا گیا جس کے نتیجے میں ۴۰ افراد ہلاک اور درجنوں مویشی ہلاک ہوگئے"
> (ایڈورڈ گیرارڈ ایک مشہور [illegible])

انسان کا قانون زندگی کیا ہو؟ اس کا جواب مارکس نے یہ دیا کہ قانون زندگی متعین کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ قانون کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مقصد اور نصب العین موجود ہو۔ انسان کی پیدائش کا کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا وجود حادثاتی طور پر مادہ کے تغیر سے ہوا ہے۔ انسان کی ضرورت صرف کھانا، کپڑا اور مکان ہے۔ سماج میں بستے ہوئے مختلف افراد اشتراکی نظام قائم کر کے

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

ہفت روزہ بادباں لاہور کے ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی کہتے ہیں۔

سید مودودی زندہ ہیں زندہ رہیں گے

یہ چہرہ چہرہ اداس کیوں ہے؟ یہ ہر آنکھ نمناک کیوں ہے؟ ہر دل فگار کیوں ہے؟ یہ قریہ قریہ آواز کیوں ہے؟ یہ گوشہ گوشہ پکار کیوں ہے؟ یہ غم کی برسات کیوں ہے؟ یہ سورج کی کرنیں کیوں بجھ گئی ہیں؟ یہ چاند کا رنگ کیوں اڑا اڑا ہے؟ یہ پھولوں کی تاب کیوں تھک گئی ہے؟ یہ پہاڑ جیسے انسان یہ سمندروں سے پیٹنے یہ دریاؤں سے دل کیوں لرز رہے ہیں؟ کیوں بکھر رہے ہیں، کیوں رو رہے ہیں، کیوں رو رہے ہیں؟

اے وہ لوگو جو یہ سب دیکھ رہے ہو، اے وہ لوگو جو اس سب کا حصہ ہو، اے وہ آنکھو جو پانیوں میں ڈوب گئی ہو، اے وہ مسکراہٹو جو دم توڑ گئی ہو ــــ

اے انسانو، اے پہاڑو، اے زمینو، اے زمانو نہیں کیا ہوا ہے۔ تم پر کیا گذر گئی ہے۔ تمہیں کس نے اداس کر ڈالا ہے، کس نے تم سے زندگی چھین لی ہے؟

یہ آواز ہی ــــ کیا بجلی لہرائی ــــ کیا روشنی لرزی ــــ کیا اجالا گہنا گیا ــــ کیا اندھیرا چھایا ــــ سید مودودی انتقال کر گئے۔ وہ شخص اس جہاں سے رخصت ہو گیا کہ جو ایک شخص نہیں تھا۔ جو ایک عہد تھا، عہد ساز تھا۔ جو شخصیت ہی نہیں، شخصیت ساز تھا۔ جو ادارہ ہی نہیں ادارہ ساز تھا ــــ جو انقلاب تھا، انقلاب کی آواز تھا۔ جس نے برسوں پہلے نصف صدی پہلے للکارا پکارا، اے مسلمانو۔ اٹھو مسلمان بن جاؤ اور پھر دنیا کو مسلمان بنا دو۔ اٹھو اپنی زندگی بدلو اور پھر پوری انسانیت کی زندگی بدل ڈالو ــــ اٹھو اپنی ذات میں انقلاب پیدا کرو۔ پھر پوری دنیا میں، انقلاب کی صدا بن جاؤ۔ اٹھو کہ تمہارا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، صرف اور صرف تمہارے رب کے لئے ہے۔ اٹھو کہ خدا کا گھر مسجد کا مقام مسجد تک محدود نہیں ہے۔ ہر بازار، کوچے، گلی محلے، تھانے، کچہری، ایوان اور جھونپڑی کو مسجد بنا ڈالو ــــ اٹھو، دیکھو، سمجھو، اسلام پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے، یہ رسومات کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ ایک طرز زندگی ہے۔ اس میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اٹھو، سیاست، معاشرت، معیشت، سب پر اس مذہب کے احکام نافذ کرو، ہر شعبے کو مسلمان بنا دو۔

جب یہ آواز گونجی تو یہ احساس ہوا کہ یہ عہد کی تنہا آواز تھی ــ صدیوں کی غلامی نے صدیوں سے بلند ہونے والی اس آواز کو بھلا ڈالا تھا۔ جب یہ آواز گونجی تو ہر شخص اپنے اپنے بت لے کر آگے بڑھا اس آواز کا راستہ روک لیا۔ یہ شخص مذہب کو لازم بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ تجدید دین چاہتا ہے۔ یہ بڑے بڑے جبوں پر تنقید کرتا ہے یہ علماء کی گرہیں کھولتا ہے، یہ مدرسوں پر برستا ہے۔ یہ کالجوں کو [illegible] ہے، یہ مسٹروں سے مسٹری اور ملا سے ملائیت چھین لینے کے درپے ہے، یہ نسل، رنگ اور زبان کے بت نہیں مانتا۔ انہیں توڑ دینا چاہتا ہے اس کا راستہ روک لینا چاہیئے ــ اس کا گلا گھونٹ دینا چاہیئے۔

سو، راستہ غلاظتوں سے اٹ گیا۔ رکاوٹوں سے پٹ گیا۔ ایک قدم بڑھنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا ــــ لیکن یہ شخص اپنا راستہ آپ بنانے کا قائل تھا۔ اس کے ہاں عقیدہ تھا، استقلال تھا۔ اس نے اعلان کر دیا، دنیا میں حق کا استقبال اسی دھوم دھام سے ہوتا آیا ہے۔ یہ شان اہل حق کی ہے کہ ان کا اسی طرح خیر مقدم کیا جائے ــــ جب جب داعی انقلاب کے ادنیٰ غلام ہیں اس کے لئے بھی سنگ اور طائف کی گلیاں ہی سوغاتیں لے کر بڑھتی تھیں ــــ سو یہ شخص کھڑا رہا، آواز دیتا رہا، اپنے ہاتھ سے غلاظتیں ہٹاتا رہا، [illegible] عام کرتا رہا اور آگے بڑھتا گیا۔ راستہ صاف ہوتا گیا ــــ اور اس

شخص نے ۷۵ برس گزار کر اس دنیا سے نقل مکانی کی ہے۔ تو زمانے بھر میں اس کی آواز گونج رہی ہے، پاکستان سے ایران اور اس سے آگے کہیں آگے اس کی آواز دلوں کو گرما رہی ہے، "انقلاب، انقلاب، اسلامی انقلاب" ـــ اب دنیا بھر میں وہ اسلامی انقلاب کا پیغامبر بن گیا ہے۔ اور ہر جگہ کے مسلمان اس کے راستے میں پھول بچھاتے اور اپنے راستے کے کانٹے ہٹاتے ہیں۔ کئی برس پہلے کا تنہا آدمی، آج تنہا نہیں ہے۔ آج وہ روح عصر ہے "عزیز جہان" ہے راحت دل وجان ہے۔

تو پیارے لوگو! تم کس جھوٹی خبر پر ایمان لائے ہوئے ہو، آنسوؤ! تم کس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ اے اندھیرو! تم کیوں خوش ہو رہے ہو۔ اور اے اجالو! تم کیوں مضطرب ہو۔ تمہیں خبر نہیں کہ سید مودودی مر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو بس ایک بستی سے دوسری بستی کی طرف گئے ہیں۔ پہلے ان کی رہائش پر سرزمین تھی اب وہ ذرا زیر زمین ہے۔ پہلے وہ ۵ اے ذیلدار پارک کے پختہ کمرے میں رہتے تھے۔ اب چند قدم کے فاصلے پر دائمی گھر میں جا بسے ہیں ـــ وہ عمر بھر کی مشقت سے تھک بہت گئے ہیں۔ اب ذرا آرام کریں گے۔ اور پھر اس وقت ہم سے آملیں گے جب ہم سب اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے۔

موت تو اس کو آتی ہے جو بس ایک آدمی ہوتا ہے جو فکر نہیں ہوتا، نظریہ نہیں ہوتا، جو انقلاب نہیں ہوتا، جو اصول نہیں ہوتا۔ فکر اور نظریہ کبھی نہیں مرتا، اصول اور انقلاب کبھی نہیں ڈوبتے ـــ

سید مودودی انقلاب کی آواز تھے۔ خود انقلاب تھے۔ ان کیلئے موت کہاں؟ وہ بس امتحان گاہ سے عظیم الشان کامیابی حاصل کرکے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کرنے گئے ہیں ـــ اب ہم ہی امیدوار امتحان گاہ ہے۔ اب پھر کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے ـــ ہم نے سید مودودی کے راستے کو اپنا لیا تو کامیابی ہمارے بھی قدم چوم لے گی نہیں تو ہم زندہ رہتے ہوئے بھی مردہ کہلائیں گے۔ وہ زندگی تو خود ہی ختم ہو جاتی ہے۔

تو اے لوگو آؤ اور اپنی زندگی کو زندگی کے سانچے میں ڈھالو اور سن لو اور سمجھ لو کہ سید مودودی کی موت کی خبر غلط ہے بالکل غلط ـــ اسے پھیلاؤ، اداسی جھٹک دو، اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر لو، اپنے دلوں کو اضطراب سے نجات حاصل کرو۔ سید مودودی زندہ ہیں، زندہ ہیں، زندہ ہیں، زندہ رہیں گے!!!!

حبیب الرحمٰن شامی،

(بقیہ عقیدہ آخرت صفحہ ۲۰ سے آگے)

عَمِلْتُمْ ۔ تغابن ۶

پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے دنیا میں کیا کچھ کیا

قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ سبا ۳

کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی وہ تم پر آکر رہے گی، اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں، نہ ذرہ سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۔ سبا ۱۔ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۔ سبا ۲۔

حمد اس خدا کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لئے حمد ہے اور وہ دانا اور باخبر ہے۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ہر چیز کو وہ جانتا ہے وہ رحیم اور غفور ہے

پہلی آیت میں صفت ربوبیت دوسری میں حکمت و مغفرت اور تیسری اور چوتھی میں ربوبیت اور کائنات کی تمام چیزوں سے علم و واقفیت کو وقوع آخرت پر بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔

منصب مبارکپوری استاذ جامعۃ القادریہ

غزل

شہروں میں ستم کی شورش سے ہر فرد ہی پیچ و تاب میں ہے
اُف امن و اماں کی کشتی بھی افتادہ بڑے گرداب میں ہے

یاں بادِ خزاں کے جھونکوں سے ہر شاخ مسلسل ہے لرزاں
ہر آن ستم سے خوف و خلش ، بلبل کے دلِ بیتاب میں ہے

مطلب کے تو ساتھی ہیں سارے، بے حال یہ اپنے لوگوں کا
جو چیز تھی پہلے جان وفا، وہ آج کہاں احباب میں ہے

جب علم و ہنر خود پاس نہ ہو تو فخر نسب ہے لاحاصل
جو علم و ہنر سے ملتا ہے وہ فضل کہاں انساب میں ہے

تو حسن پہ اپنے مت اترا، کردار سے عظمت ملتی ہے
روباہ میں پیدا کیا ہوگی، وہ بات جو شیرِ غاب میں ہے

روشن و تاباں چہرہ اس کا، چاند کا جیسے چہرہ ہے
ہے بات جو اس میں اور مگر، وہ بات کہاں مہتاب میں ہے

اے بادِ صبا کے جھونکو تم، خاموش چلو یا رہنے دو
وہ حسن کا پتلا، ناز مجسم، جاگ نہ جائے خواب میں ہے

شمع کی ضو سے جھلمگ جلگ آبِ جبیں کا عالم ہے
گویا چڑھتی دھوپ میں، حرکت، جیسے کسی تالاب میں ہے

تو زینتِ و سر افرازی ہے، رتبہ کسی کا بڑھتا نہیں
مینار سے عزت میں ہے سوا، گو کتنی تھی محراب میں ہے

جس میں کہ نہ ہو اخلاص و ادب، حیوان ہے وہ بشکل بشر
انساں کی شرافت اے منصف! اخلاص میں ہے آداب میں ہے

اشتراکیت اپنے قلعے میں

ماؤزے تنگ کے جانے کے بعد چینی سوشلزم میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ سوشلزم کی بنیاد مرکزی کنٹرول ہوتا ہے چین کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے حالیہ اجلاس میں طے کیا ہے کہ پیداوار کو بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ مرکزی کنٹرول اور منصوبہ بندی کو کم کیا جائے۔ چین کا رہنما حقیقت میں چین کے موجودہ طاقتور شخص ڈینگ زیاؤپنگ کا ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ ڈینگ زیاؤپنگ معتوب تھا اس کے بیٹے کو ماؤ کے ثقافتی انقلاب میں اوپر کی منزل سے گرا دیا گیا تھا۔ زیاؤپنگ اس وقت پیکنگ کا میئر تھا۔ جب معتوب رہا تو لیو شاؤچی کی مانند ایک طویل مدت تک نظروں سے غائب رہا۔ ماؤزے تنگ کی موت کے بعد اس کا عروج شروع ہوا۔ اور اب وہ اتنا طاقتور ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اور حکومت اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔ وہ سوشلزم کی شدید جکڑ بندی کے خلاف ہے۔ اس نے وہ سوشلزم کا شکنجہ بتدریج نرم کر رہا ہے۔ سب سے پہلی تبدیلی ۱۹۷۸ء میں کی گئی۔ اجتماعی زراعت کی وجہ سے کسانوں کی اپنے کھیتوں اور فصلوں سے دلچسپی بالکل کم ہو کر رہ گئی تھی ۱۹۷۸ء میں کمیونسٹ پارٹی نے طے کیا کہ چینی اجتماعی کاشتکاری کی بجائے کاشتکاری کا ذمہ وارانہ نظام رواج کیا جائے۔ یعنی کاشتکاروں کو اپنی فصل کی کاشت انتظام اور منصوبہ بندی کی ذمہ داری انہیں پر ڈالی جائے اس رعایت کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو گیا۔ چین کو ۱۹۷۸ء میں ۲ ارب ڈالر کا غلہ درآمد کرنا پڑا تھا۔ اس آزادی نے اتنا غلہ پیدا کیا کہ ۱۹۸۳ء میں چین کو صرف ایک ارب ۳۰ ڈالر کا غلہ درآمد کرنے کی ضرورت پڑی۔ اور اب شاید ضرورت بھی نہ پڑے۔

زراعت میں آزادی کے خوشگوار نتائج سے سب کا حوصلہ بڑھا۔ چنانچہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے حالیہ اجلاس میں ایک اور انقلابی فیصلہ کیا گیا۔ وہ یہ کہ معیشت کو پابندیوں اور کنٹرول سے مزید آزادی دی جائے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کا حالیہ اجلاس ۲۰ر اکتوبر کو ہوا ہے اسی اجلاس کے آخر میں جو اعلانیہ جاری کیا گیا اس کا عنوان ہے۔ "ملک کے اقتصادی ڈھانچے میں اصلاحات کا فیصلہ"۔

اس فیصلے میں اشتراکی فلسفے کا جائزہ لینے کے بعد کہا گیا ہے کہ چین کی اشتراکیت اپنے چینی ماحول کے مطابق ہونی چاہئے صرف اسی صورت میں چین اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کر سکتا ہے

چنانچہ اس فیصلے کے بعد صنعتوں کو قدرے خودمختاری دے دی گئی ہے اور انہیں کہا گیا ہے کہ اپنے گاہکوں کی ضرورت کے مطابق اشیاء تیار کریں۔ اس سے قبل ہر چیز سرکاری منصوبے اور حکم کے مطابق تیار ہوتی تھی۔ دوسری طرف عوام سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت جمع کرنے کی بجائے خرچ کریں۔ اس سے پیداوار کو مہمیز لگے گی۔ چنانچہ چین کے بازاروں اور دکانوں میں تھوڑی ہی مدت میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی ہے۔ پہلے لباس اور ضرورت کی اشیاء ایک رنگ اور ایک طرز کی ہوا کرتی تھیں لباس میں کافی تنوع آگیا ہے۔ اور کاروبار کے اندر بھی مقابلہ ہونے لگا ہے۔

مغربی مبصر اس تبدیلی کو چین کی اشتراکیت سے مراجعت قرار دے رہے ہیں لیکن چینی کمیونسٹ پارٹی کا اصرار ہے کہ یہ سوشلزم کی صحیح راہ ہے جس سے سابق گمراہ ہے۔ اس سے قبل تمام جھگڑا تھا جسے اب درست کر دیا گیا ہے

(ایشیا)

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ میں ششماہی امتحان، طلبہ تیاری میں ہمہ تن مصروف

گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جامعہ میں شعبۂ عالی اور ثانوی کے امتحانات ۱۰ ربیع الاول بمطابق ۸ دسمبر ۸۴ء سے شروع ہو چکے ہیں، اور شعبۂ ابتدائی کا امتحان ۱۵ دسمبر ۸۴ء سے ان شاء اللہ شروع ہو جائے گا۔ امتحان کا یہ سلسلہ یکم ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ بمطابق ۲۵ دسمبر ۸۴ء تک جاری رہے گا۔ طلبہ ہر طرف سے کٹ کر اپنے اسباق کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ہیں۔

جناب مولانا ابو اللیث صاحب ندوی کی آمد

باہم طلبہ و اساتذہ جامعہ کیلئے یہ مسرت ہے کہ امیر جماعت اسلامی اور سابق ناظم جامعہ جناب مولانا ابو اللیث صاحب ندوی ۱۵ ربیع الاول یعنی ۹ دسمبر ۸۴ء کو ۹ بجے جامعہ تشریف لائے۔ مولانا موصوف کی آمد ان کی دیرینہ قلبی لگاؤ اور یہاں سے وابستہ امیدوں کی واضح دلیل ہے۔ مولانا کی آمد پہ ایک ہلکا پھلکا استقبالیہ کا بھی پروگرام تھا جس میں اساتذہ اور کارکنان شریک تھے۔

انجمن طلبۂ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ۱۰ دسمبر ۸۴ء

۱۰ دسمبر ۸۴ء کو جامعہ میں انجمن طلبۂ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل امور طے پائے۔

۱۔ ۱۸، ۱۹، ۲۰ فروری ۱۹۸۵ء کو دو سالہ اجلاس منعقد ہوگا، کارروائی ان شاء اللہ ۹ بجے صبح شروع ہو جائے گی اور تیسرے دن دوپہر تک چلے گی۔ ممبران شوریٰ کے لیے طے کیا گیا کہ ۱۷ فروری کو ۱۰ بجے صبح تک آ جائیں۔ ناظم اجتماع انصار احمد صاحب فلاحی ہوں گے۔

(۲) دو سالہ اجلاس تک ایک پندرہ روزہ خبرنامہ شائع کیا جائے گا جس میں اجتماع سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں گی۔

(۳) انجمن کی شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ انجمن حسب سابق جامعہ کے ماحول میں یگانگت و ہم آہنگی کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کی کوشش برابر جاری رکھے گی۔

جامعہ کے ایک قدیم اور سابق استاذ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے

یہ بات نہایت افسوس کی ہے کہ ماسٹر عبد الحمید صاحب سابق استاذ جامعہ نے دسمبر ۸۴ء کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف نہایت مخلص اور محنتی استاد تھے اور جامعۃ الفلاح سے ان کا دیرینہ تعلق تھا۔ آپ جامعہ کے ابتدائی اساتذہ میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کرے اور جنت میں جگہ دے۔ آمین

جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کے ذمہ داران

سکریٹری	محمد حسن
معتمد کتب	افضال الحسن
جنرل مانیٹر	حافظ اسرار احمد
معتمد اخبارات و رسائل	صغیر احمد
معتمد خطابت عربی	مجاہد الاسلام
معتمد خطابت اردو تعلیم عربی تا ہفتم	انور کمال صدیقی
(اول تا عربی چہارم)	عبد اللہ
معتمد خطابت انگریزی	انوار احمد
اسٹور انچارج	انیس احمد
گیم انچارج	سراج الدین
معتمد برائے صفائی	نظام الدین کاکوری